31
سیرتِ آلِ محمد علیہم السلام
آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shahidmutairi.com
www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

نام کتاب	سیرت آل محمد علیہم السلام
مصنف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
مترجم	عابد عسکری (فاضل قم)
سیٹنگ	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (0333-4031233)
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

''شہید مطہری فاؤنڈیشن'' دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ ادارے کا مطمع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور انٹرنیٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیر نظر کتاب ''سیرت آل محمد علیہم السلام'' شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔ جس کا اُردو ترجمہ جناب عابد عسکری (فاضل قم) نے کیا ہے۔ بلاشبہ سیرت اور کردارِ آل محمد علیہم السلام اُن کے عمل اور فرمان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حیدر کرار علیہ السلام کا فرمانِ ذی شان ہے۔ ''یعنی کیا تم مجھ پر یہ امر عائد کرنا چاہتے ہو کہ جن لوگوں کا حاکم ہوں ان پر ظلم وزیادتی کر کے (کچھ لوگوں کی) امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم جب تک دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور کچھ ستارے دوسرے ستاروں کی طرف جھکتے رہیں گے میں اس چیز کے قریب بھی نہیں بھٹکوں گا''۔ آیئے کتاب ھذا میں کردارِ آلِ محمد علیہم السلام کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی کو سنوار لیں۔

ادارہ ھذا نے اس کتاب کے موضوعات کو مختلف ایرانی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔ کتاب کو پاکستان کی عوام کے پسندیدہ خط، فونٹ اور انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نیٹ پر اَپ لوڈ کرنے والوں کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔ اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

فہرست مضامین

❁❁❁❁❁

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت علی علیہ السلام کی مشکلات

ومن کلام له دعونی والتمسوا غیری فانّا مستقبلون امرا له وجوه والوان لا تقوم له القلوب ولا تثبت علیه العقول و انّ الافاق قد اغامت المحجة قد تنکرت و اعلمو انّی ان اجبتکم رکبت بکم ما اعلم[1]

"یعنی مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لئے) میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈ لو، ہمارے سامنے ایک اور معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں جسے نہ دل برداشت کر سکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں" دیکھو افق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں" راستہ پہچاننے میں نہیں آتا، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تمہاری خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستے پر لے چلوں جو میرے علم میں ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام دوسرے خلفاء کی موجودگی میں اور ان کے بعد بہت زیادہ مشکلات میں تھے آپ کو کسی لحاظ سے بھی چین سے رہنے نہ دیا گیا" طرح طرح کی شورشیں اور سازشیں آپ کے ارد گرد خطرہ بن کر منڈلاتی رہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد لوگوں کا ایک انبوہ آپ کے در دولت پر حاضر ہوا اور اصرار کیا کہ وہ امام وقت کے طور پر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیں لیکن امام علیہ السلام خاموش رہے اور انتہائی دکھی انداز میں فرمایا۔

"دعونی والتمسوا غیری"

"مجھے چھوڑ دو خلافت کے لئے میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈ لو"

اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ معاذ اللہ حضرت اپنے آپ کو خلافت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہل نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ تو مسند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیٹھنے کے لئے سب سے زیادہ مستحق و سزاوار تھے، پھر فرمایا:

"فانا مستقبلون امرا له وجوه والوان"

"یعنی ہمارے سامنے ایک اور معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں۔"

اس جملے کی وضاحت کرتے ہوئے امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وان الافاق قد اغامت"

کہ دیکھو افق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں"

والمحجة قد تنکرت"

کہ راستے پہچانے نہیں جاتے"

آپ اسی خطبہ میں مزید فرماتے ہیں:

"واعلموا انی ان اجبتکم رکبت بکم ما اعلم"

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستے پہ لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے۔" [1]

اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والی کی سرزنش پہ کان نہیں دھروں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسے میں

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲.

ہوں" اور ہوسکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا (تمہارے دینوی مفاد کے لئے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔

امام علیہ السلام کے اس قول سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس قدر مشکل حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ میں ایک نشست میں ان تمام مشکلات کے بارے میں تفصیل سے گفتگو نہیں کرسکتا۔ فی الحال حضرت علی علیہ اسلام کی ایک" مشکل" بتاتا ہوں کہ جو آپ کے لئے پوری سوسائٹی اور مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ مشکل تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے لئے سب سے پہلی مشکل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل تھا۔ اس لئے تو امام علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ابھی بہت سی مشکلات نے آنا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں عفریت کی مانند اپنا اپنا منہ کھولے ہوئے ہیں۔ حضرت علیؑ اس حالت میں مسند خلافت پر تشریف لاتے ہیں کہ ان سے پیشرو خلیفہ کو چند نامعلوم افراد نے اس لئے قتل کر دیا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری حضرت علیؑ پر پڑے۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں نے ان کی تدفین کے وقت بیشمار اعتراضات کیے اب وہی گروہ حضرت علی علیہ السلام کے ارد گرد جمع تھے" ایک طرف قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت کا دم بھرنے والے لوگ جو حجاز" مدینہ" بصرہ" کوفہ اور مصر سے آئے ہوئے تھے۔ اور ان کے جذبات واحساسات میں ایک طرح کا طوفان برپا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام دو گروہوں کے درمیان انتہائی حیرانگی کے عالم میں سوچ رہے تھے کہ وہ کریں تو کیا کریں" اگر کسی خاص گروہ کی حمایت کرتے تو بھی ٹھیک نہیں تھا کسی کی مخالفت کرتے تب بھی موقعہ محل کے خلاف تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام عثمان رضی اللہ عنہ کی کچھ پالیسیوں کے مخالف ہوں۔ اختلاف رائے ایک طرف لیکن یہ اختلاف ایسا نہ تھا کہ حضرت علی علیہ السلام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خواہش کریں یا ان کے قتل میں کسی قسم کی مداخلت کریں آپ صلح جو" امن پسند شخصیت تھے۔ آپ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب نہج البلاغہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا چودہ مرتبہ تذکرہ کیا ہے۔ دراصل یہی تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ امن وآشتی

کے کس قدر حامی اور طرف دار تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے قبل اور قتل کے بعد آپ کا رویہ انتہائی صلح جو یانہ رہا۔آپ صبر و استقامت کی زندہ مثال بن کر بھیرے ہوئے حالات اور بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنے اور متحد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے کوئی اس قتل کے خلاف سراپا احتجاج نظر آرہا تھا، کوئی ان کی مخالفت کی وجہ سے تبدیلی خلافت پر اطمینان کا سانس لے رہا تھا، کہ آپ نے خلیفۂ وقت اور حاکم اسلامی ہونے کے ناطے سے کسی خاص گروہ کی حمایت نہیں کی بلکہ آپ کی کاوشوں اور کوششوں کا مرکز صرف ایک تھا کہ جیسے ہی بن پڑے اختلاف وتفرقہ کی فضا ختم ہو کر خوشگوار اور پرامن ماحول میں تبدیل ہو۔حضرت علی علیہ السلام بخوبی جانتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے بے شمار مسائل کھڑے ہوں گے۔اور یہی قتل اسلام اور مسلمانوں کے اختلاف کی سب سے بڑی وجہ اور سبب بنے گا۔آخر وہی ہوا جس کا آپ نے نہج البلاغہ میں خدشہ ظاہر کیا تھا۔آج جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہی حقیقت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حاشیہ نشینوں نے قتل کرایا تھا۔ان شرپسندوں کی شروع سے کوشش یہ تھی کہ جس عثمان رضی اللہ عنہ طرح بھی ہو مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کیا جائے، ان کے اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کیا جائے۔

چنانچہ یہ شرپسند اس تاڑ میں تھے کہ جناب امیر علیہ السلام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث کر کے وسیع پیمانے پر فتنہ وفساد کھڑا کریں۔تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ امیر شام قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں ہر لحاظ سے ملوث تھا وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کو آپس میں لڑانے میں مصروف تھا۔وہ شروع ہی سے عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازشیں بنا رہا تھا۔اسے یہ بھی یقین تھا کہ دو گروہوں کی باہمی آویزیش اور لڑائی کے باعث قتل

عثمان رضی اللہ عنہ کی مذموم سازش ایک تو کامیاب رہے گی، دوسرا اصل قاتل کا پتہ نہیں چل سکے گا، تیسرا اس کا اصلی مشن کامیاب ہو جائے گا اور مسلمان ایک دوسرے سے دست بہ گریبان ہو کر اپنی مرکزیت کھو بیٹھیں گے۔ان حالات ومشکلات کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام کو گوناگوں ومسائل سے دوچار ہونا پڑا۔یہ اک موڑ تھا کہ جہاں منافقین مادی طور پر اپنے مکارانہ وعیارانہ حربوں میں کامیاب ہو گئے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس طرح اور اسی نوعیت کی مشکلات سے دوچار تھے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کی مشکلات میں بہت بڑا فرق ہے۔سرکار رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بت پرست توحید کے منکر تھے اور علانیہ طور پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے انکار کرتے تھے اور ان کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ ہی یہی تھی کہ حضور توحید کا اعلان نہ کریں، اور بتوں کے خلاف کچھ نہ کہیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ ایک ایسے گروہ سے تھا کہ جو علانیہ طور پر خود کو مسلمان تو کہلواتے تھے لیکن حقیقت میں وہ مسلمانوں والا کردار نہیں رکھتے تھے۔ان کا نعرہ اسلامی تھا لیکن ان کا اصلی مقصد ذاتی حکومت کی بنیاد ڈالنا کرنا تھا۔امیر شام کا باپ ابوسفیان بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے کے لئے میدان جنگ میں آیا حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اس سے لڑنا آسان تھا۔لیکن اسی ابوسفیان کا بیٹا امیر شام ذاتی حکومتی مقاصد لے کر حضرت علی علیہ السلام سے آکر لڑا۔اور اس نے آپ کی بھرپور مخالفت کی، طرح طرح کی اذیتیں دیں۔لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہوئے تو اس نے اس آیت کو:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا

"اور جو شخص ناحق مارا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو (قاتل پر قصاص کا) قابو دیا ہے۔" (سورہ اسراء۔33)

عنوان بنا کر خون عثمانؓ کا مطالبہ کیا۔ وہ لوگوں کے احساسات وجذبات
سے کھیل کر خون خرابہ کرنا چاہتا تھا۔اس وقت اصل وارث کون ہے؟ تو کون ہے حضرت
عثمانؓ کو اپنا کہنے والا۔ تیرا تو ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ سب سے پہلے تو
حضرت عثمانؓ کا بیٹا موجود ہے۔ان کے دیگر رشتہ دار بھی موجود ہیں۔ دوسرا تیرا ان
کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے؟ دراصل وہ ایک چالاک اور عیار شخص تھا وہ اس مقتول
صحابی رسول کے خون کو ذریعہ احتجاج بنانا چاہتا تھا۔اس کا اصل مقصد حضرت علیؑ کی
راہ میں رکاوٹیں اور مشکلات کھڑی کرنا تھا۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ جب بھی اور
جیسا بھی ہو سکے مسلمانوں کی وحدت کو ختم کر کے ان میں ہر طرح کی تفریق ڈالی جائے
۔حضرت عثمانؓ زندہ تھے تو امیر شام نے جناب عثمانؓ کو قتل کرنے کے لئے
اپنے کرائے کے قاتل اور جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔اور اس نے اپنے گماشتوں سے
کہہ رکھا تھا کہ جس وقت حضرت عثمانؓ قتل ہو جائیں ان کا خون آلود کرتہ فوری طور
پر میری طرف شام روانہ کیا جائے۔خبردار کہیں۔ یہ خون خشک نہ ہونے پائے۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ کا خون آلود کرتہ اور حضرت عثمانؓ کی زوجہ
محترمہ کی انگلی کاٹ کر یہ دونوں چیزیں امیر شام کی طرف روانہ کی گئیں۔اندر سے اس
کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو گیا لیکن ظاہر میں وہ سراپا احتجاج نظر آیا۔اس نے اپنے کارندوں کو حکم
دیا کہ حضرت عثمانؓ کی اہلیہ کی کٹی ہوئی انگلیاں اس کے منبر کے پاس لٹکا دی
جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اس نے بلند آواز سے کہا اے لوگو! دیکھو تو سہی کتنا ظلم ہو
گیا ہے کہ خلیفہ وقت کی بیوی کی انگلیاں بھی کاٹ دی گئی ہیں۔اس نے حکم دیا کہ
حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیراہن نوک نیزہ پر لٹکا کر مسجد کے قریب کسی جگہ پر
نصب کیا جائے۔ جب ایسا کیا گیا تو امیر شام وہاں پر پہنچ گیا۔اور حضرت عثمانؓ کی
مظلومیت پر زار و قطار رونے لگا۔ وہ گریہ کرتا رہا۔اور وہ اس قتل کے بہانے سے لوگوں

کو احتجاج کرنے پر مجبور کرتا رہا۔اس کا عوام سے بار بار یہی مطالبہ تھا کہ لوگو اٹھو بہت
بڑا ظلم ہو گیا ہے۔ خلیفہ رسول ﷺ بڑی بے دردی سے قتل کیے گئے ہیں۔ آپ
لوگوں پر فرض عائد ہوتا کہ عثمانؓ کے خون ناحق کا بدلہ لیں۔ یہ قتل علیؑ ہی نے کیا
ہے۔لہذا ان سے انتقام لینا ہم سب کا دینی و مذہبی فریضہ ہے۔ دیکھو تو سہی کہ انقلابی
طبقہ سب کا سب علیؑ کے ارد گرد جمع ہے۔ اور انہی لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو
شہید کیا ہے۔غرض یہ کہ امیر شام طرح طرح کے حیلے بہانے بناتا رہا اس کی سازش ہی
کہ وجہ سے جنگ جمل جنگ صفین کے نام سے دو جنگیں وجود میں آئیں۔

(استاد محترم علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم نہج البلاغہ کے اس خطبہ کی تشریح
کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قتل ہو جانے سے مسند حکومت خالی
ہوئی تو مسلمانوں کی نظریں امیر المومنینؑ کی طرف اٹھنے لگیں، جن کی سلامت روی،
اصول پرستی اور سیاسی بصیرت کا اس طویل مدت میں انہیں بڑی حد تک تجربہ ہو چکا تھا،
چنانچہ متفقہ طور پر آپ کے دست حق پرست پہ بیعت کے لئے اس طرح ٹوٹ پڑے
جس طرح بھولے بھٹکے مسافر دور سے منزل کی جھلک دیکھ کر اس کی سمت لپک پڑتے
ہیں، جب کہ مؤرخ طبری نے لکھا ہے:" لوگ امیر المومنینؑ پر ہجوم کر کے ٹوٹ
پڑے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام
پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اور پیغمبر ﷺ کے قریبیوں کے بارے میں ہماری
کیسی آزمائش ہو رہی ہے۔" مگر امیر المومنینؑ نے ان کی خواہش کو قبول کرنے سے
انکار کر دیا۔جس پر ان لوگوں نے شور مچایا؟ اور چیخ چیخ کر کہنے لگے اے ابوالحسنؑ!

آپ اسلام کی تباہی کو نہیں دیکھ رہے فتنہ و شر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو
نہیں دیکھتے، کیا آپ خدا کا خوف بھی نہیں کرتے پھر بھی حضرت نے آمادگی کا اظہار نہ
فرمایا، کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ پیغمبر ﷺ کے بعد جو ماحول بن گیا تھا اس کے

اثرات دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں ۔طبیعتوں میں خود غرضی و جاہ پسندی جڑ پکڑ چکی ہے، ذہنوں پر مادیت کے غلاف چڑھ چکے ہیں اور حکومت کو مقصد برآریوں کا ذریعہ قرار دینے کی عادت پڑ چکی ہے ۔اب خلافت الٰہیہ کو بھی مادیت کا رنگ دے کر اس سے کھیلنا چاہیں گے ۔ ان حالات میں ذہنیتوں کو بدلنے اور طبیعتوں کے رخ موڑنے میں لوہے لگ جائیں گے ۔ان اثرات کے علاوہ یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ ان لوگوں کو سوچ سمجھ لینے کا موقعہ دے دیا جائے تا کہ کل اپنی مادی توقعات کو ناکام ہوتے دیکھ کر یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ بیعت وقتی ضرورت اور ہنگامی جذبہ کے زیر اثر ہوگئی ۔ اس میں سوچ بچار سے کام نہیں لیا گیا تھا غرض جب اصرار حد سے بڑھا تو اس موقعہ پر یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس امر کو واضح کیا گیا کہ اگر تم مجھے مقاصد کے لئے چاہتے ہو تو میں تمہارا آلہ کار بننے کے لئے تیار نہیں، مجھے چھوڑ دو۔

اور اس مقصد کے لئے کسی اور کو منتخب کر لو جو تمہاری توقعات کو پوری کر سکے۔

تم میری سابقہ سیرت کو دیکھ چکے ہو میں قرآن وسنت کے علاوہ کسی کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار نہیں اور نہ حکومت کے لئے اپنے اصول سے ہاتھ اٹھاؤں گا ۔اگر تم کسی اور کو منتخب کرو گے تو میں ملکی قوانین وآئین حکومت کا اتنا ہی خیال کروں گا جتنا ایک پرامن شہری کو کرنا چاہیئے ۔ میں نے کسی مرحلہ پر بھی شورش برپا کر کے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو پراگندہ و منتشر کرنے کی کوشش نہیں کی ۔

چنانچہ اب بھی ایسا ہی ہوگا بلکہ جس طرح مصالح عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیشہ صحیح مشورے دیتا ہوں ۔ابھی دریغ نہ کروں گا اور اگر تم مجھے اسی سطح پر رہنے دو تو یہ چیز تمہارے دنیوی مفاد کے لئے بہتر ہوگی کیونکہ اس صورت میں میرے ہاتھوں میں اقتدار نہیں ہوگا کہ تمہارے دنیوی مفادات کے لئے سدّ راہ بن سکوں، اور تمہاری من مانی خواہشوں میں روڑے اٹکاؤں، اور اگر یہ ٹھان چکے ہو کہ میرے ہاتھوں پر بیعت

کیے بغیر نہ رہو گے تو پھر یاد رکھو چاہے تمہاری پیشانیوں پر بل آئیں اور چاہے تمہاری زبانیں میرے خلاف کھلیں میں حق کی راہ پر لے چلنے پر مجبور کر دوں گا، اور حق کے معاملہ میں کسی کی رورعایت نہیں کروں گا اس پر بھی اگر بیعت کرنا چاہتے ہو تو اپنا شوق پورا کر لو ۔امیر المومنین علیہ السلام نے ان لوگوں کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا تھا بعد کے واقعات اس کی پوری پوری تصدیق کرتے ہیں ۔ چنانچہ جن لوگوں نے ذاتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر بیعت کی تھی جب انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو بیعت توڑ کر الگ ہو گئے اور بے بنیاد الزامات تراش کر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے)۔

عدالت کے بغیر ہر گز نہیں

حضرت علی علیہ السلام کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ اس وقت کا معاشرہ ایک طرح کی بے مقصدیت میں کھو چکا تھا، لوگ ناجائز کاموں اور غلط رویوں کے عادی بن چکے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرہ میں سفارش عروج پر تھی، خاندانی معیار فضیلت کو سامنے رکھا جاتا تھا۔ دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام تھے کہ عدالت کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ نہیں ہوں کہ عدالت سے ایک بال برابر بھی انحراف کروں یہاں تک کہ آپ کے ایک صحابی کو کہنا پڑا کہ قبلہ عالم آپ اپنے انداز میں کچھ نرمی لے آیئے۔ آپ نے اس کی بات کو سن کر احساس ناگواری کے ساتھ فرمایا:

"اتامرونی ان اطلب النصر بالجور واللہ ما اطور بہ ماسمر سمیر" [1]

"یعنی کیا تم مجھ پر یہ امر عائد کرنا چاہتے ہو کہ جن لوگوں کا حاکم ہوں ان پر ظلم وزیادتی کرکے (کچھ لوگوں کی) امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم جب تک دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور کچھ ستارے دوسرے ستاروں کی طرف جھکتے رہیں گے میں اس چیز کے قریب بھی نہیں بھٹکوں گا۔"

[1] نہج البلاغہ، ۱۲۴۔

سیاست ہو تو ایسی

حضرت علی علیہ السلام کی تیسری مشکل یہ تھی کہ آپ کی سیاست سچائی، صداقت، اور شرافت پر مبنی تھی۔ آپ کی ہر بات حقیقت ہوا کرتی تھی۔ آپ لگی لپٹی بات کرنے کے عادی نہ تھے۔ اور نہ ہی کسی کو اندھیرے میں رکھتے تھے۔ آپ کے اس انداز کو آپ کے کچھ دوست پسند نہ کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مولا علیہ السلام کچھ تو ظاہری رکھ رکھاؤ کر لیا کریں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ سیاست یہ نہیں ہے کہ اس میں جھوٹ بولا جائے، یا منافقت اختیار کی جائے یا جھوٹ بول کر مطلب نکال لیا جائے، بلکہ سچی، کھری، حقیقی سیاست یہ ہے، کہ سچ کہو اس کے سوا کچھ نہ کہو۔ آپ کی حقیقت پسندی اور صاف گوئی کو دیکھ کر کچھ لوگ کہا کرتے تھے کہ علی علیہ السلام تو سیاست نہیں جانتے، امیر شام کو دیکھئے وہ کتنا بڑا سیاستدان ہے آپ نے فرمایا:۔

"واللہ مامعاویۃ بادھی منی ولکنہ یغدر ویفجر، ولولا کراھیۃ الغدر لکنت من ادھی الناس ولکن کل غدرۃ فجرۃ وکل فجرۃ کفرۃ ولکل غادر لواء یعرف بہ یوم القیامۃ!"

"یعنی خدا کی قسم امیر شام مجھ سے زیادہ چلتا پرزہ اور ہوشیار نہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ غداریوں سے چوکتا اور بدکرداریوں سے باز نہیں آتا، اگر مجھے عیاری وغداری سے نفرت نہ ہوتی تو میں سب لوگوں سے زائد ہوشیار وزیرک ہوتا۔ لیکن ہر غداری گناہ اور ہر گناہ حکم الٰہی کی نافرمانی ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن ہر غداری کے ہاتھوں میں ایک جھنڈا ہوگا جس سے

وہ پہچانا جائے گا۔" [1]

(استاد محترم علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ افراد جو مذہب و اخلاق سے بیگانہ " شرعی قید و بند سے آزاد اور جزاء و سزا کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کے لئے مطلب براری کے لئے حیل و ذرائع کی کمی نہیں ہوتی "وہ ہر منزل پر کامیابی و کامرانی کی تدبیریں نکال لیتے ہیں۔ جہاں انسانی و اسلامی تقاضے اور اخلاقی و شرعی حدیں روگ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں وہاں حیلہ و تدبیر کا میدان تنگ اور جولانگاہ عمل کی وسعت محدود ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امیر شام کا نفوذ و تسلط انہی تدابیر و حیل کا نتیجہ تھا۔ جن پر عمل پیرا ہونے میں اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی، نہ حلال و حرام کا سوال اس کے لئے سد راہ ہوتا تھا، اور نہ پاداش آخرت کا خوف، اسے ان مطلق العنانیوں اور بے باکیوں سے روکتا تھا، جیسا کہ جناب راغب اصفہانی اس کی سیرت و کردار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں" اس کا مطمع نظر یہی ہوتا تھا کہ جس طرح بن پڑے اپنا مطلب پورا کرو نہ حلال و حرام سے اسے کوئی واسطہ تھا نہ دین کی اسے کوئی پرواہ تھی اور نہ خدا کے غضب کی کوئی فکر تھی۔

چنانچہ اس نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے غلط بیانی و افتراء پردازی کے سہارے ڈھونڈ ہے۔ طرح طرح کے مکر و فریب کے حربے استعمال کیے اور جب یہ دیکھا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کو جنگ میں الجھائے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی تو طلحہ و زبیر کو آپ کے خلاف ابھار کر کھڑا کر دیا اور جب اس صورت سے کامیابی نہ ہوئی، تو شامیوں کو بھڑکا کر جنگ صفین کا فتنہ برپا کر دیا اور پھر حضرت عمار کی شہادت سے جب اس کا ظلم و عدوان بے نقاب ہونے لگا تو عوام فریبی کے لئے کبھی یہ کہہ دیا کہ عمار کے قاتل علی

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۱.

علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہی انہیں ہمراہ لانے والے ہیں۔ اور کبھی حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لفظ فئۃ باغیۃ کی یہ تاویل کی کہ اس کے معنی باغی گروہ کے نہیں بلکہ اس کے معنی طلب کرنے والی جماعت کے ہیں۔ یعنی عمار اس گروہ کے ہاتھوں سے قتل ہوں گے جو خون عثمان کے قصاص کا طالب ہوگا، حالانکہ اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا (کہ عمار ان کو بہشت کی دعوت دیں گے اور وہ انہیں جہنم کی طرف بلائیں گے) اس تاویل کی کوئی گنجائش پیدا نہیں کرتا، جب ایسے اوچھے ہتھیاروں سے فتح و کامرانی کے آثار نظر نہ آئے تو قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کا پرفریب حربہ استعمال کیا حالانکہ اس کی نظروں میں نہ قرآن کا کوئی وزن اور نہ اس کے فیصلہ کی کوئی اہمیت تھی۔

اگر اسے قرآن کا فیصلہ ہی مطلوب ہوتا تو یہ مطالبہ جنگ کے چھڑنے سے پہلے کرتا اور پھر جب اس پر حقیقت کھل گئی کہ عمرو ابن عاص نے ابوموسیٰ کو فریب دے کر اس کے حق میں فیصلہ کیا ہے اور اس کے فیصلہ کو قرآن سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے تو وہ اس پرفریب تحکیم کے فیصلہ پر رضامند نہ ہوتا۔ اور عمرو ابن عاص کو اس فریب کاری کی سزا دیتا یا کم از کم تنبیہ و سرزنش کرتا مگر یہاں تو اس کے کارناموں پر اس کی تحسین آفرین کی جاتی ہے۔ اور کارکردگی کے صلہ میں اسے مصر کا گورنر بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس امیر المؤمنین علیہ السلام کی سیرت شریعت و اخلاق کے اعلیٰ معیار کا نمونہ تھی، وہ ناموافق حالات میں بھی حق صداقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے تھے اور اپنی پاکیزہ زندگی کو حیلہ و مکر کی آلودگیوں سے آلودہ نہ ہونے دیتے تھے، وہ چاہتے تو حیلوں کا توڑ حیلوں سے کر سکتے تھے، اور اس کی رکاکت آمیز حرکتوں کا جواب ایسی ہی حرکتوں سے دیا جا سکتا تھا، جیسے اس نے فرات پر پہرہ بٹھا کر پانی روک دیا تھا۔ تو اس کو اس امر کے جواز میں پیش کیا جا سکتا تھا کہ جب عراقیوں نے فرات پر قبضہ کر لیا تو ان پر بھی پانی بند کر دیا جاتا، اور اس ذریعہ سے ان کی قوت حرب و ضرب کو مضمحل کر کے انہیں مغلوب

بنالیا جاتا مگر امیر المؤمنین علیہ السلام ایسے ننگ انسانیت اقدام سے کہ جس کی کوئی آئین واخلاق اجازت نہیں دیتا کبھی اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیتے تھے۔ اگرچہ دنیا والے ایسے حربوں کو دشمن کے مقابلہ میں جائز سمجھتے ہیں اور اپنی کامرانی کے لئے ظاہر و باطن کی دورنگی کو سیاست وحسن تدبیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

مگر امیر المؤمنین علیہ السلام کسی موقعہ پر فریب کاری و دورنگی سے اپنے اقتدار کے استحکام کا تصور بھی نہ کرتے۔ چنانچہ جب لوگوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ عثمانی دور کے عمال کو ان کے عہد برقرار رہنے دیا جائے اور طلحہ وزبیر کو کوفہ وبصرہ کی امارت دے کر ہمنوا بنالیا جائے اور امیر شام کو شام کا اقتدار سونپ کر اس کے دنیوی تدبیر سے فائدہ اٹھایا جائے، تو آپ نے دنیوی مصلحتوں پر شرعی تقاضوں کو ترجیح دیتے ہوئے اسے ماننے سے انکار کردیا اور امیر شام کے متعلق صاف لفظوں میں فرمایا۔

"اگر میں امیر شام کو اس کے علاقہ پر برقرار رہنے دوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا قوت بازو بنا رہا ہوں۔" [1]

ظاہر بین لوگ صرف ظاہری کامیابی کو دیکھتے ہیں اور یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ یہ کامیابی کن ذرائع سے حاصل ہوئی؟ یہ شاطرانہ چالوں اور عیارانہ گھاتوں سے جسے کامیاب وکامران ہوتے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اور اسے مدبر، بافہم اور سیاستدان وبیدار مغز اور خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں، اور جو الٰہی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی پابندی کی وجہ سے چالوں اور ہتھکنڈوں کو کام میں نہ لائے اور غلط طریق کار سے حاصل کی ہوئی کامیابی پر محرومی کو ترجیح دے وہ ان کی نظروں میں سیاست سے ناآشنا اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے کمزور سمجھا جاتا ہے

[1] استیعاب، ج۱،ص۲۵۹.

۔ انہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ یہ سوچیں کہ ایک پابند اصول وشرع کی راہ میں کتنی مشکلیں اور رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں کہ جو منزل کامرانی کے قریب پہنچنے کے باوجود اسے قدم آگے بڑھنے سے روک دیتی ہیں۔

خوارج حضرت علی علیہ السلام کیلئے ایک بنیادی مشکل

مولائے کائنات علیہ السلام کی ایک بنیادی مشکل میں عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے قبل ایک ضروری بات وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں ایک گروہ پیدا ہوا یہ لوگ حضور کے پرچم تلے جمع ہوگئے۔ آپ نے اس طبقہ کو تعلیم وتربیت دی، اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ قدم قدم پر ان لوگوں کی رہنمائی کی۔ رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات اس کے قلب وذہن میں گھر کر گئیں۔ ادھر پیغمبر اکرم ﷺ نے سر زمین مکہ میں قریش سے طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں، آپ نے حد سے زیادہ مظالم سہے، لیکن آپ نے قدم قدم پر صبر وتحمل سے کام لیا۔ آپ کے اصحاب عرض کرتے ہیں کہ حضور ﷺ آپ ہمیں جنگ لڑنے اور دفاع کرنے کی اجازت عنایت فرمائی دیں، آخر ہم کب تک ان لوگوں کے مظالم برداشت کرتے رہیں گے؟ آخر کب تک یہ افراد ہم پر پتھروں کی بارش کرتے رہیں گے؟ کب تک ہم ان کے کوڑے سہتے رہیں گے؟ ظالموں کا ظلم حد سے بڑھ گیا۔ آپ نے جہاد کی اجازت نہ دی، جب اصرار بڑھا تو آپ نے فرمایا آپ لوگ ہجرت کر سکتے ہیں۔

ان میں سے کچھ لوگ حبشہ چلے آئے۔ یہ ہجرت مسلمانوں کے لئے سودمند ثابت ہوئی۔ اس سوال کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ تیرہ سال کی مدت میں کیا کرتے رہے؟ حضور ﷺ لوگوں کی تربیت کرتے رہے، ان کو تعلیم کی روشنیوں سے روشناس کراتے رہے۔ ہجرت کے وقت ان لوگوں کی تعداد ایک ہزار

کے لگ بھگ تھی۔ یہ لوگ اسلام کی حقیقتوں کو پوری طرح سے جانتے تھے۔ ان کی تربیت خالصتاً اسلامی طریقے پر ہوئی۔ درحقیقت یہ ایک تحریک تھی ایسے افراد کی جو تعلیم وتربیت، علم وعمل کے اسلحہ سے لیس تھے۔

راہ حق کے جانبازوں نے قریہ قریہ، گلی گلی جا کر اسلام کا پرچار کیا، جس طرح ان کی تبلیغ میں تاثیر تھی اسی طرح لوگوں نے اتنی ہی تیزی سے اسلام کو قبول کیا۔ نتیجہ چہار سو اسلام کی کرنیں پھیل گئیں۔ ماحول منور ہوگیا، فضا معطر ہوگئی، بس کیا تھا ہر طرف اسلام ہی اسلام کی باتیں ہو رہی تھیں، پرچم اسلام بڑی زرق وبرق اور شان وشوکت کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

یہاں پر میں اتنا عرض کروں گا کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کے زمانوں اور حالات میں بہت فرق تھا۔ جناب رسالت ماب ﷺ کے مقابلے میں کافر تھے۔ ایسے لوگ کہ جن کا عقیدہ صریحاً کافرانہ ومنکرانہ تھا۔ وہ علانیہ طور پر کہا کرتے تھے کہ ہم کافر ہیں اور کفر ہی کی حفاظت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ سے لڑ رہے ہیں، لیکن جناب علی علیہ السلام کا مقابلہ منافقوں سے تھا ایسے منافق کہ جن کی زبان پر تو اسلام تھا لیکن ان کے دل کفر کا دم بھرتے تھے۔ اسلام وقرآن کا نام تو لیتے تھے لیکن اندر سے وہ اسلام کے سخت مخالف اور قرآن کے دشمن تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان لوگوں نے بے پناہ فتوحات حاصل کیں لیکن انہوں نے حضور پاک ﷺ کی تمام تر تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔

آپ نے تیرہ (۱۳) سال تک لوگوں کو دفاع وجہاد کی اجازت اس لئے نہ دی کہ یہ لوگ بہت کم ظرف تھے۔ حضور ﷺ کی تمام کوششوں کا محور یہ تھا کہ اسلامی تہذیب پھلے پھولے، ایمانی تمدن میں وسعت پیدا ہو، لوگ پرچم اسلام تلے جمع ہوں، بدقسمتی سے اس وقت کے لوگ اپنے اس راستے سے ہٹ گئے جو کہ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعین کیا تھا وہ ظاہر میں اسلام اسلام کی رٹ لگاتے ہوئے نظر آتے تھے لیکن حقیقت میں وہ حقیقی اسلام اور اسلام محمدی کی اصلی روح سے نا آشنا تھے۔ یہ لوگ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے تھے لیکن ان کے قلوب معرفت اور ان کے اذہان بصیرت سے بالکل ناواقف تھے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ خالی خولی اور خشک مقدس تھے۔ لمبی لمبی داڑھیاں اور پیشانیوں پر سجے ہوئے سجدہ کے علامتی نشانات، صوفیانہ وضع قطع، مولویانہ انداز زندگی، زاہدانہ رہن سہن رندانہ طرز تبلیغ۔ یہ تقدس مآب لوگ لمبے لمبے سجدے کرتے تھے۔ جب حضرت علی علیہ السلام نے جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا تو یہ سب مولائے کائنات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابن عباس نے مولا کی خدمت میں عرض کی کہ:۔

"لھم جباہ قرحۃ لطول السجود"

مولا ان کی پیشانیاں کثرت سجود سے زخمی ہوگئی ہیں"

واید کثفنات الابل"

ان کے ہاتھ اونٹ کے زانو کی مانند سخت ہو چکے ہیں"

علیھم قمص مرحضۃ"

انہوں نے پرانے لباس پہن کر خود کو زاہد ظاہر کر رکھا ہے"

وھم مشمرون"

تاویل کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوتی " یہ سب کے سب ایک ہی طرز کی زندگی گزار رہے ہیں"

یہ طبقہ اور یہ گروہ جہاں جاہل اور نادان تھا وہاں خشک مقدس بھی تھا۔ ان کا زاہدانہ انداز زندگی بھی حقیقی نیکی اور اخلاص و معرفت سے خالی تھا۔ انہوں نے اسلام

اسلام کی رٹ لگا رکھی تھی۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ اصل اسلام کیا ہے، اسلامی تعلیمات کا مقصد حقیقی کیا ہے؟ اسلام کن کے لئے اور کس کس مقصد کے لئے لایا گیا ہے؟ مولا امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا رک جاؤ۔ ٹھہر جاؤ میری طرف توجہ کرو، میری بات سنو میں آپ کو بتاتا ہوں یہ کون لوگ ہیں؟

"جفاۃ طغام عبید اقزام، جمعوا من کل اوب وتلقطوا من کل شوب ممن ینبغي ان یفقه ویودب ویعلم ویدرب......
لیسو من المهاجرین والا نصار ولا من الذین تبؤ الدار وایمان!" [1]

"یعنی وہ تندخواو باش اور کمینے بدقماش ہیں کہ ہر طرف اکھٹے کر لئے گئے ہیں۔ اور مخلوط النسب لوگوں میں سے چن لئے گے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جہالت کی بناء پر اس قابل ہیں کہ انہیں ابھی اسلام کے متعلق کچھ بتایا جائے، اور شایستگی سکھائی جائے اچھائی اور برائی کی تعلیم دی جائے، اور عمل کی مشق کرائی جائے، اور ان پر کسی نگران کو چھوڑا جائے، اور ان کے ہاتھ پکڑ کر چلایا جائے، نہ تو وہ مہاجر ہیں نہ انصار اور نہ ان لوگوں میں سے ہیں جو مدینہ میں فروکش تھے"۔

حضرت علی علیہ السلام جب مسند خلافت پر بیٹھے تو عجیب وغریب صورت حال تھی، اور اس نوع کے مسلمان موجود تھے یہاں تک کہ آپ کے سپاہیوں اور فوجیوں میں بھی اس طرح کے لوگ موجود تھے۔ آپ جنگ صفین میں امیر شام اور عمروعاص کی

[1] نہج البلاغہ، ۲۳۸.

شاطرانہ چالوں کے بارے میں بار بار پڑھ چکے ہیں، اور متعدد بار سن چکے ہیں جب ان لوگوں نے دیکھا کہ وہ شکست کے قریب ہیں تو انہوں نے ایک بہانہ اور ایک اسکیم تیار کی اور ایک حیلہ تراشا تا کہ جنگ بند ہو جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اے لوگو! ہم سب قرآن مجید کو ماننے والے ہیں، ہمارا قبلہ پر بھی مکمل ایمان ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں؟ اگر آپ لڑنا بھی چاہتے ہیں تو آیئے سب سے پہلے قرآن پر حملہ کیجئے۔ یہ سننا تھا کہ سبھی نے تلواریں نیام میں کر لیں، اور جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور ایک زبان ہو کر کہا بھلا کس طرح قرآن مجید سے لڑائی کی جا سکتی ہے؟

یہ لوگ فوراً مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مولا مسئلہ حل ہو گیا ہے، قرآن مجید کی وجہ سے لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ جب ہمارے درمیان قرآن مجید آ گیا تو پھر جھگڑا کس بات کا، لڑائی کس چیز کے لئے" جنگ وجدال کا کیا مقصد؟ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا کیا ہم نے پہلے ہی دن سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمیں قرآن مجید اور اسلام کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہئے، دیکھیں تو سہی کہ ہم میں حق پر کون ہے؟ یہ جھوٹ بکتے ہیں" یہ قرآن مجید نہیں لے آئے بلکہ قرآن مجید کی جلد اور کاغذ کو ڈھال قرار دیا ہے تا کہ بعد میں قرآن مجید کے خلاف قیام کریں۔ آپ اس کی طرف دھیان نہ دیں۔ میں تمہارا امام ہوں" میں ہی قرآن ناطق ہوں۔ آپ لڑیں اور خوب لڑیں یہاں تک کہ ٹڈی دل دشمن میدان سے بھاگ جائے۔ یہ سن کر یہ لوگ کہنے لگے یا علی علیہ السلام آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اب تک تو ہم آپ کو اچھا انسان خیال کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اب پتہ چلا کہ آپ جاہ طلب انسان ہیں" بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے خلاف جنگ کریں؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا لڑنا ہے تو آپ خود جا کر لڑیں ہم اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتے؟

مالک اشتر میدان جنگ میں نبرد و پیکار تھے۔ ان لوگوں نے امام سے بار بار اصرار کیا کہ مولا مالک سے کہیں کہ وہ واپس آ جائیں اور قرآن مجید کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لیں۔ امام نے پیغام بھیجا مالک واپس لوٹ آیئے۔ مالک نے عرض کی کہ قبلہ عالم ایک دو گھنٹہ کی مہلت دیجئے یہ ٹڈی دل لشکر جنگ ہارنے والا ہے۔ یہ واپس آ گئے اور عرض کی مولا مالک جنگ کرنے سے باز نہیں آ رہے۔ آیا یا مالک کو روکیں ورنہ بیس ہزار تلوار آپ پر حملہ آور ہو جائے گی۔ مولا نے پیغام دیا کہ مالک اگر تم علی علیہ السلام کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو واپس لوٹ آؤ۔ وہ لوگ حضرت کے پاس آئے اور عرض کی ہم دو شخص بطور منصف تجویز کرتے ہیں۔ اب جبکہ قرآن مجید کی بات نکلی ہے تو ہم بہترین منصف مقرر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے عمرو عاص کا نام تجویز کیا اور جناب امیر علیہ السلام نے ابن عباس کا نام پیش کیا، اس پر راضی نہ ہوئے اور کہا یا علی علیہ السلام چونکہ وہ آپ کے چچازاد بھائی ہیں اور آپ کے رشتہ دار ہیں ہم تو اس شخص کے نام کی منظوری دیں گے جو کہ رشتہ میں کچھ نہ لگتا ہو۔ آپ نے فرمایا ابن عباس نہ سہی" مالک اشتر کا نام لکھ لیں" وہ بولے مالک بھی ہمیں منظور نہیں ہیں۔ امام نے چند نام اور دیئے انہوں نے منظور نہ کیے۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے بولے کہ ہم تو صرف ابوموسیٰ اشعری کو تسلیم کرتے ہیں۔ ابوموسیٰ وہ شخص ہے جو اس سے بیشتر کوفہ کا گورنر تھا اور مولائے کائنات نے اس کو عہدہ سے معزول کر دیا تھا۔

ابوموسیٰ کا دل حضرت علی علیہ السلام کے لئے صاف نہیں تھا بلکہ وہ امام علیہ السلام کے خلاف شدید قسم کا کینہ و بغض رکھتا تھا۔ وہ لوگ ابوموسیٰ کو لے آئے، لیکن عمرو عاص نے ابوموسیٰ کو بھی دھوکہ دے دیا۔ جب ان لوگوں نے سمجھا کہ وہ فیصلہ کے وقت دھوکہ کھا چکے ہیں تو امام علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں تو فریب دیا گیا، دراصل ان کا یہ اعتراف جرم ایک طرح کی دوسری غلطی تھی۔ اس وقت ہم جنگ سے ہاتھ نہ اٹھاتے

اور امیر معاویہ سے لڑتے رہتے، وہ جنگ ایک عام جنگ تھی، اس میں قرآن مجید کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا، ہم نے ابوموسیٰ کو منصف مان کر بھی شدید غلطی کی ہے، ہم اگر ابن عباس یا مالک اشتر کو مان لیتے تو بہتر تھا، واقعتاً جو شخص خدا کے فیصلے سے ہٹ کر کسی انسان کا فیصلہ مان لیتا ہے وہ حقیقت میں کفر کرتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ

حکومت تو بس صرف خدا ہی کے لئے ہے" (سورہ انعام، ۵۷)

جب قرآن مجید نے کہا کہ فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہونا چاہئے کوئی انسان اس کے بغیر فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہم سب کافر ومشرک ہو گئے اس لئے ہم سب کو بارگاہ الٰہی میں توبہ کرنی چاہیے۔" استغفر اللہ ربی واتوب الیہ" کہنے لگے یا علی علیہ السلام آپ بھی ہماری طرح منکر خدا ہو گئے ہیں، اس لئے توبہ کریں۔ اب آپ اندازہ فرمائیں کہ علی علیہ السلام کس قدر مشکلات میں ہیں۔ یہاں پر ایک طرف امیر شام۔۔۔۔۔علی علیہ السلام کے لئے دردسر اور مسئلہ بنا ہوا ہے، دوسری طرف عمرو عاص نے مولا کو پریشان کر رکھا ہے" تیسرا ان عقل کے اندھوں اور جاہل ترین افراد نے امام علیہ السلام وقت کے لئے مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا، نہیں نہیں تم لوگ غلطی پر ہو فیصلہ کرنا کفر نہیں ہے" دراصل تم لوگوں کو اس آیت" ان الحکم الا اللہ" کا معنی ہی نہیں آتا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو قانون اللہ تعالیٰ کا معین کردہ ہو" اور اس نے اپنے بندوں کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دے دی ہو کیا تم بھول گئے ہو جب ہم نے کہا تھا" کہ دو آدمی لے آؤ جو قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے کسی قسم کی غلطی نہیں کی جو چیز شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ میں اس کو کیسے غلط کہہ سکتا ہوں۔ یہ نہ کفر ہے اور نہ شرک یہ تو میرا فیصلہ ہے آگے آپ لوگوں کی اپنی مرضی۔

خوارج کے ساتھ علی علیہ السلام کا رویہ

ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام سے اپنا راستہ جدا کر لیا، خوارج کے نام سے ایک فرقہ بنا لیا۔ ان کا مقصد صرف اور صرف علی علیہ السلام کی مخالفت کرنا تھا جب تک ان لوگوں نے امام علیہ السلام کے خلاف مسلح جنگ نہ کی اتنے تک امام علیہ السلام ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہے، یہاں تک کہ بیت المال میں سے ان کے مستحق لوگوں کو حصہ دیا جاتا تھا، ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

خارجی لوگ دوسروں کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کی اہانت کرتے، لیکن امام علیہ السلام خاموش رہتے اور صبر وتحمل سے کام لیتے۔ آپ جب منبر پر تقریر کر رہے ہوتے تو کچھ خارجی آپ کی تقریر کے دوران سیٹیاں بجاتے اور آوازیں کستے۔ ایک روز آپ تقریر فرما رہے تھے ایک شخص نے امام علیہ السلام سے ایک مشکل ترین سوال کیا، آپ نے اسی وقت اس انداز میں اس قدر آسان جواب دیا کہ تمام مجمع عش عش کر اٹھا، تکبیر کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہاں پر ایک خارجی بیٹھا ہوا تھا اور بولا:

"قاتله الله ما افقهه"

کہ خدا ان کو مار ڈالے کس قدر علامہ ہے یہ شخص"

آپ کے اصحاب نے اس شخص کو پکڑ کر مارنا چاہا لیکن امام علیہ السلام نے فرمایا اسے چھوڑ دو اس نے بدتمیزی تو مجھ سے کی ہے زیادہ سے زیادہ تو آپ اس کو تو بیخ ہی کر سکتے ہیں۔ اس کو اپنے حال پر رہنے دو، جو کہتا ہے کہتا پھرے جن کی فطرت میں ہو ڈسنا وہ ڈسا کرتے ہیں۔

علی علیہ السلام حاکم وقت تھے، مسجد میں نماز، باجماعت پڑھا رہے تھے آپ
اندازہ فرمائیے کیسا حلیم وبردبار ہے ہمارا امام علیہ السلام ان خارجیوں نے آپ کی اقتداء میں
نماز نہیں پڑھی، کہنے لگے علی علیہ السلام تو (نعوذ باللہ) مسلمان ہی نہیں ہیں، یہ کافر ومشرک
ہیں، حالانکہ حضرت سورہ حمد اور دوسری سورہ کی تلاوت کررہے تھے۔ وہاں پر ابن
الکواب نامی شخص موجود تھا، اس نے طنزیہ طور پر یہ آیت بلند آواز سے پڑھی:۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ [1]

"وہ یہ آیت پڑھ کے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ یا علی علیہ السلام یہ درست ہے کہ
آپ سب سے زیادہ پکے مسلمان ہیں، آپ کی عبادات اور دینی خدمات
قابل قدر ہیں، چونکہ آپ نے نعوذ باللہ شرک کیا ہے"

علی علیہ السلام اس آیت کے مطابق:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا

"(لوگو) جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور چپ چاپ رہو"
(سورہ اعراف، ۲۰۴)

آپ خاموش ہو کر نماز پڑھتے رہے اس نے تین چار مرتبہ اسی طرح کا طنز
کیا، آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝۶۰

اے رسول! تم صبر کرو" بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ جو لوگ
(تمہاری) تصدیق نہیں کرتے تمہیں (بہکا کر) خفیف کردیں۔"
(سورہ روم)

[1] سورہ زمر، ۶۵۔

خوارج کا عقیدہ کیا

خارجیوں نے اس حد تک اکتفاء کیا ہے؟ اگر اتنا ہی کرتے تو حضرت علی علیہ السلام
کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی اتنی پریشانی کی بات تھی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ
فرقے اور گروہ کی صورت اختیار کرلی، جس طرح ہم نے عرض کیا ہے کہ وہ ظاہری
صورت میں تو مسلمان تھے لیکن وہ پس پردہ کافر ومشرک تھے، کیونکہ انہوں نے اپنی
طرف سے ایک نظریہ بلکہ عجیب قسم کے نظریات قائم کرلئے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ
چونکہ حضرت علی علیہ السلام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ کے حکم (منصف) کو قبول کیا
ہے، اس لئے وہ اپنے اسلامی عقیدہ سے منحرف ہوگئے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ بھی
کافر ہوگئے تھے۔ چونکہ بقول ان کے ہم نے توبہ کرلی ہے اس لئے ہمارا عقیدہ صحیح ہو
گیا ہے ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

یہ ظالم حکمران ان کے خلاف قیام کرنے کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ
دراصل انتہا پسند اور متعصب قسم کے تھے کہ جو خود کو اچھا سمجھتے تھے اور دوسروں پر کیچڑ
اچھالتے رہتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ عمل ایمان کا جز ہے وہ کہتے تھے کہ جو

"اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله"

کہے اور دل سے نہ مانے، تو کہنے سے انسان مسلمان نہیں ہوجاتا۔ اگر وہ
نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، شراب نہ پیئے، جوا نہ کھلئے، فعل بد کا مرتکب نہ ہو، جھوٹ
نہ کہے اگر وہ تمام گناہ نہ کرے تو تب مسلمان ہے۔ اگر ایک مسلمان جھوٹ بول لیتا ہے
وہ کافر ہوجائے گا، وہ نجس ہے، اور مسلمان نہیں ہے۔ اگر ایک مرتبہ غیبت کرے یا
شراب پی لے تو دین اسلام سے خارج ہے۔ غرض کہ انہوں نے گناہان کبیرہ کے

مرتکب کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کو ناپاک، کافر، مشرک اور نجس سمجھتے تھے۔ صرف اپنے آپ کو ہر لحاظ سے نیک اور پاک خیال کرتے تھے۔ گویا یہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کوئی بھی ان کے سوا مسلمان وجود نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔ لیکن اس کی کوئی شرط وغیرہ نہیں ہے۔ یہ لوگ مولا علی علیہ السلام کو نعوذ باللہ مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کی علی علیہ السلام کے خلاف قیام کرنا اور ان سے جنگ کرنا نہ فقط کار ثواب ہے بلکہ بہت بڑی عبادت ہے۔ ان جاہلوں اور تنگ نظر لوگوں نے شہر کے باہر خیمہ نصب کیا۔ اور باغی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کے عقائد اور نظریات میں انتہا پسندی، تنگ نظری کے سوا کچھ نہ تھا یہ خارجی چونکہ دوسرے لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے، اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ ان لوگوں کو رشتہ دینا چاہیے نہ لینا چاہیے۔ ان کا ذبح شدہ گوشت حلال نہیں ہے، بلکہ ان کی عورتوں اور ان کے بال بچوں کا قتل جائز اور باعث ثواب ہے۔

انہوں نے شہر سے باہر ایک ڈیرہ جما لیا اور شہر کے باسیوں کی قتل وغارت شروع کر دی، یہاں تک کہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اہلیہ کے ہمراہ وہاں سے گزر رہا تھا وہ بی بی حاملہ تھی انہوں نے اس صحابی سے کہا کہ وہ علی علیہ السلام پر تبرا کریں۔ جب انہوں نے انکار کیا تو ان ظالموں نے اس عظیم اور بزرگ صحابی کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کے شکم کو نیزے سے زخمی کر دیا اور کہا تم کافر تھے اس لئے ہم نے تمہارے ساتھ ایسا کیا۔ یہ خارجی ایک دوسرے خارجی کے باغ سے گزر رہے تھے تو ایک خارجی نے کھجور کا ایک دانہ توڑ کر کھا لیا تو سبھی چیخ پڑے اور بلند آواز سے کہا کہ اس کا مال نہ کھاؤ کیونکہ ہمارا مسلمان بھائی ہے۔ یعنی یہ خارجی اور پلید صفت انسان دوسرے مسلمان کو کافر اور خود کو مسلمان کہا کرتے تھے۔

خارجیوں کے ساتھ مولا علی علیہ السلام کا مجاہدانہ مقابلہ

خارجیوں کی جارجانہ کاروائیاں اور ظالمانہ سرگرمیاں جب حد سے تجاوز کرنے لگیں تو مولا علی علیہ السلام نے ان کے مقابلے میں ایک جری بہادر افراد پر مشتمل ایک لشکر تشکیل دیا، اب دوسرے مسلمانوں اور بے گناہ انسانوں کو خارجیوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ آپ نے ابن عباس کو ان سے بات چیت کرنے کیلئے بھیجا "جب وہ واپس آئے تو مولا کو ان الفاظ میں رپوٹ دی" یا حضرت! ان کی پیشانیوں پر محرابوں کا نشان ہے۔ ان کے ہاتھ کثرت عبادت کی وجہ سخت ہو گئے ہیں" پرانا لباس اور زاہدانہ انداز زندگی مولا میں کس طرح ان کے ساتھ مذاکرات کروں؟ حضرت علی علیہ السلام خود تشریف لے گئے اور ان سے بات چیت کی، اور یہ گفتگو بہت سود مند ثابت ہوئی۔ بارہ ہزار افراد میں سے آٹھ ہزار آدمی نادم وشرمندہ ہوئے۔ علی علیہ السلام نے ایک علم نصب کیا اور فرمایا جو شخص اس پرچم تلے آ جائے گا وہ محفوظ رہے گا۔ آٹھ ہزار آدمی اس پرچم کے سائے میں آ گئے۔ لیکن چار ہزار اشخاص نے کہا کہ ہم کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے۔

کائنات کے عظیم صابر اور بہادر امام نے تلوار اٹھائی اور ان ظالموں کی گردنیں گاجر مولی کی طرف کاٹ ڈالیں۔ ان میں دس آدمیوں نے معافی مانگ لی، آپ نے ان کو چھوڑ دیا۔ ان نجات پانے والوں میں سے ایک عبدالرحمٰن بن ملجم تھا۔ یہ شخص خشک مقدس انسان تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کا نہج البلاغہ میں ایک جملہ

ہے" واقعتاً علیؑ علیؑ ہے" یہاں سے اس عالی نسب امام کی عظمت و رفعت ظاہر ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں:۔

"انا فقات عین الفتنة ولم یکن لیجتری علیها احد غیری بعدان ما ج غیبها واشتد کلبها" [1]

"اے لوگو! میں نے فتنہ وشر کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں۔ جب اس کی تاریکیاں (موجوں کی طرح) تہ و بالا ہو رہی تھیں اور (دیوانے کتوں کی طرح) اس کی دیوانگی زوروں پر تھی تو میرے علاوہ کسی ایک میں جرأت نہ تھی کہ وہ اس کی طرف بڑھتا"۔

اس طرح کے لوگ جو خود کو مقدس اور پارسا سمجھتے ہیں ان کا ذہن اتنا تنگ و تاریک ہو چکا ہوتا ہے کہ کسی کی بات کو برداشت نہیں کرتے۔ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو جان سے مار دینے میں کسی قسم کی پس و پیش نہیں کرتے۔ یہی لوگ تھے جو یزید کے حق میں ایک جگہ پر جمع ہو گئے اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر ڈالا۔ اس قسم کے لوگوں کا مقابلہ کرنا واقعتاً دل گردے کی بات ہے۔ یہ ایک طرف قرآن مجید پڑھتے، خدا کی عبادت کرتے تھے دوسری طرف دنیا کے صالح ترین افراد کو قتل کرتے۔ مولا خود فرماتے ہیں کہ ان مشکل ترین حالات میں میرے سوا کسی میں جرأت پیدا نہ ہوئی کہ ان کی جارحیت کا مقابلہ کرے، حالانکہ اس وقت بڑے بڑے ایسے ایسے لوگ تھے جو خود کو سب سے بڑا مسلمان کہلواتے تھے" لیکن میں نے ان ظالموں کے خلاف تلوار بلند کی اور مجھے اس پر فخر ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

"بعدان ما ج غیبها"

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲.

"یعنی میں نے فتنہ وشر کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں۔ اور جب اس کی تاریکیاں (موجوں کی طرح) تہ و بالا ہو رہی تھیں"

امام علیہ السلام کا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت حالات بہت زیادہ پیچیدہ تھے صورت حال انتہائی خطرناک تھی۔ ابن عباس جب ان کے پاس گئے تو دیکھا یہ تو بہت زیادہ عبادت کرنے والے ہیں۔ ان کی شکل وصورت پرہیزگاروں جیسی ہے ان کو مارنا اور ان کے خلاف تلوار بلند کرنا واقعتاً مشکل بات تھی۔ اگر ابن عباس کی جگہ پر ہم بھی ہوتے تو ان لوگوں کے خلاف ذرا بھی قدم نہ اٹھاتے۔ لیکن علی علیہ السلام کی معرفت اور جرأت کا کیا کہنا؟ آپ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی جڑوں کو کمزور کر رہے ہیں تو آپ نے دنیا اور دنیاداروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خارجیوں پر ایسی شمشیر زنی کی کہ منافقوں کا ستیاناس ہو گیا۔ اور اسلام حقیقی کا روشن اور تابناک چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نکھر کر سامنے آ گیا۔ "واشتد کلبها" اور دیوانے کتوں کی طرح اس کی دیوانگی زوروں پر تھی۔ حضرت کا جملہ بہت ہی عجیب وغریب جملہ ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو ایک باؤلے کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جب کوئی کتا باؤلے پن کا شکار ہوتا ہے تو اس کے سامنے جو بھی آتا ہے وہ اس کو کاٹ لیتا ہے۔ آپنے پرائے کی پروا نہیں کرتا وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ یہ اس کا مالک ہے۔ یا یہ کوئی دوسرا شخص ہے۔ اس قسم کے کتے کی زبان نکلی ہوتی ہے، رال ٹپکا رہا ہوتا ہے، جب کسی گھوڑے سے گزرتا ہے یا کسی انسان سے تو ان کو بھی باؤلے پن کا مریض بنا دیتا ہے، امام علی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تقدس مآب اور جعلی شریف نما لوگ دیوانے کتے کی مانند ہیں۔ یہ جس کو بھی کاٹتے ہیں اسے دیوانہ اور پاگل کر دیتے ہیں۔ اور ر دیوانے کتوں کا ایک ہی علاج ہے ان کو ختم کر دیا جائے اگر امام علیہ السلام ان کتوں کا سر قلم نہ کرتے اور شمشیر حیدری

کے ذریعے انہیں صفحہ ہستی سے نہ مٹاتے تو یہ بیماری پورے معاشرہ میں پھیل جاتی اور اس کو حماقت، جہالت اور نادانی کا شکار بنا دیتی۔ میں نے جب دیکھا کہ اسلام اور اسلامی معاشرہ ان جاہلوں کی وجہ سے سخت خطرہ میں ہے تو میں نے انتہائی جرأت مندی کے ساتھ اس بڑے فتنہ کو فنا کے گھاٹ اتار کر اسے خاموش کر دیا ہے۔

خارجیوں کی ہٹ دھرمی خارجیوں کی ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں انتہائی مضبوط تھے۔ جب عقیدہ اور نظریہ کی بات ہوتی تو یہ لوگ مر مٹتے تھے۔ انکی دوسری خوبی یہ تھی کہ یہ لوگ عبادت بہت زیادہ کرتے تھے۔ ان کی یہ صفت دوسروں کو ان کے بارے میں اچھا تأثر پیدا کرتی تھی یہی وجہ ہے کہ مولا علیہ السلام نے فرمایا کسی ایک کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ ان پر شمشیر زنی کرے۔ ان میں تیسری بات یہ تھی کہ یہ لوگ جہالت و نادانی میں بھی بہت آگے تھے۔ یعنی پرلے درجے کے اجڈ اور ان پڑھ تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اسلام پر کیا کیا گزری؟ نہج البلاغہ بہت عظیم کتاب ہے ہر لحاظ سے عجیب ہے، اسکی توحید عجیب، اس کی وعظ و نصیحت عجیب اس کی دعا و التجاء عجیب، اس کے تجزیئے عجیب۔ علی علیہ السلام جب امیر شام اور خارجیوں کے بارے تبصرہ فرماتے تھے تو کمال کر دیتے ہے۔ آپ نے خارجیوں سے فرمایا کہ "ثم انتم اشرار الناس" کہ تم بدترین لوگ ہو" آخر کیا وجہ ہے کہ آپ ان شریف نما لوگوں کو برے القابات کے ساتھ یاد کر رہے ہو۔

اگر ہم اس جگہ پر ہوں تو ہمیں کہیں گے کہ آدمی وہ اچھا ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے اور نقصان نہ پہنچائے" کچھ لوگ ان شریف نما لوگوں کو دیکھ کر ان کو صالح اور پاکباز انسان کا لقب دے رہے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مولا علی علیہ السلام ان کو بدترین اشخاص کہہ رہے ہیں؟ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ دراصل تم اور تم جیسے لوگ شیطان کے آلہ کار ہیں۔ شیطان تمہارے ذریعہ سے لوگوں کو فریب دیتا ہے اور تمہیں کمان بنا کر

دوسروں پر تیر اندازی کرتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام واضح اور واشگاف الفاظ میں خارجیوں کی اس لئے مذمت کر رہے ہیں یہ لوگ ظاہر میں قرآن پڑھتے ہیں لیکن حقیقت میں قرآنی تعلیمات کے خلاف کام کرتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں لیکن ان کی عبادت سے حقیقت کی بو نہیں آتی انہوں نے ظاہری شکل وصورت اور وضع قطع سے عام لوگوں کو فریب دے رکھا ہے۔

آپ نے تاریخ کو پڑھا ہوگا کہ حضرت علی علیہ السلام کے دور میں عمرو عاص اور امیر شام جیسے لوگ بھی موجود تھے جو امام علیہ السلام کی غیر معمولی صلاحیتوں اور معجزاتی حیثیتوں سے واقف تھے" اور یہ وہ بھی جانتے تھے کہ شجاعت، زہد وتقویٰ علم وعمل میں علی علیہ السلام کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ امیر شام حضرت علی علیہ السلام کی بہت زیادہ تعریفیں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے امام علیہ السلام سے جنگیں کیں، اور مختلف مواقع پر سازشوں کے جال بچھاتا رہا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ سب کچھ جانتے اور مانتے اور دیکھتے ہوئے بھی امام وقت کا مقابلہ کرتا ہے؟ جواب صاف ظاہر ہے اس کی عقل اور اس کے دل پر پردہ پڑ چکا تھا اور وہ عقل کا اندھا شخص شیطان کا آلہ کار بن کر وہ کچھ کرتا رہا جو نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب مولا علی علیہ السلام شہید ہوئے تو آپ کی شہادت کے بعد امام علیہ السلام کا جو بھی صحابی امیر شام کے پاس آتا تو یہ سب سے پہلے جو اس سے فرمائش کرتا تھا وہ یہ تھی کہ میرے سامنے علی علیہ السلام کے فضائل ومناقب اور ان کی خوبیاں بیان کرو، جب اس کے سامنے امام علیہ السلام کا تذکرہ کیا جاتا تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو چھلک پڑتے، اپنا زانو پیٹتا اور افسوس کرتے ہوئے وہ کہتا تھا ہائے افسوس اب علی علیہ السلام جیسا کوئی دنیا میں نہیں آئے گا۔

عمرو عاص اور امیر شام جیسے لوگ حضرت علی علیہ السلام کی عظمت ومنزلت اور عظیم الشان حکومت سے بخوبی واقف تھے آپ کے ارفع واعلیٰ مقاصد کو بھی اچھی طرح سے

جانتے تھے، لیکن دنیا کی زرق برق نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اور سیم وزر کی محبت اور طمع ولالچ نے ان کے دلوں پر تالے لگا رکھے تھے۔ دراصل یہ لوگ منافق تھے۔ انہوں نے لوگوں کو فریب دینے کیلئے دینی طرز کی وضع قطع بنا رکھی تھی۔ ان کا اصل مقصد تو مال و دولت اکٹھا کرنا اور اقتدار وحکومت کو حاصل کرنا تھا۔ علی علیہ السلام کا دشمن اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ تھا۔ اور عمرو عاص، امیر شام اور ابن ملجم جیسے منافقوں، ظالموں، شیطانی آلہ کاروں کا علی علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ تھا۔ یہ شیطانی چال چلنے والے ابلیسی سیاست کے پیرکار۔ حضرت علی علیہ السلام جیسے مرد خدا کو طرح طرح کے جالوں میں الجھاتے رہے

علی علیہ السلام پر جھوٹے الزامات عائد کیے جاتے، طرح طرح کی تہمتوں سے آپ کے دامن پاک کو داغدار بنانے کی کوشش کی جاتی یہاں تک کہ جو چیزیں علی علیہ السلام میں نہ تھیں ان کو توڑ مروڑ کر آپ کی ذات پاک کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا تھا۔ ان بدبختوں نے علی علیہ السلام کو کافر، مشرک تک بھی کہا۔ (نعوذ باللہ)

کسی نے ابن سینا کی اس رباعی کو سن کر کہا تھا کہ ابن سینا کافر ہیں وہ رباعی یہ ہے۔

کفر چومنی گزاف و آسان نبود
محکم تراز ایمان من ایمان نبود
در دہر یکی چومن و آن ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

"یعنی کفر میرے لئے اتنا سستا اور آسان نہیں تھا۔ وہ میرے ایمان سے زیادہ مضبوط پائیدار نہ تھا زمانے میں ایک میں ہوں اور وہ بھی کافر چنانچہ

پورے عالم میں کوئی مسلمان نہیں رہا"۔

دراصل بات یہ ہے کہ اب تک جتنے بھی اسلامی دانشور گزرے ہیں ان خالی خولی مولویوں اور خشک مقدس صوفیوں نے ان کو بھی تعریفی وتوصیفی نگاہ سے نہ دیکھا۔ ان کے بارے میں کبھی یہ کہا گیا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں" کبھی ان کو کھلے لفظوں میں کافر کہہ کر پکارا گیا" کبھی کہا گیا کہ یہ شیعہ تھا۔ مثال کے طور پر یہ حضرت علی علیہ السلام کا دشمن تھا۔ میں آپ کو ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے تمام مسلمان بھائیوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے۔ آپ سب مسلمانوں بیدار ہوشیار رہنا چاہیے نہروان کے خارجیوں جیسا رویہ نہیں اپنانا چاہیے، یہ نہ ہو کہ شیطانی قوتیں آپ کو آلہ کار بنا کر آپ سے غلط کام نہ لیں۔

ایک روز میرے دوست نے مجھ سے فون پر بات چیت کی جس کو سن کر مجھے بہت حیرانگی ہوئی واقعتاً بہت عجیب وغریب بات تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ علامہ اقبال پاکستانی نے اپنی کتاب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی توہین کی ہے، اور امام کو گالی بھی دی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے کہاں پڑھا ہے کہنے لگا" آپ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ بولا نہیں ایک محترم شخص نے مجھ سے کہا تھا اور میں نے آپ کو بتا دیا۔ یہ سن کر میں لرز اٹھا اور کہا کہ ہمارے ایک دوست آقائے سعیدی نے دیوان اقبال کو الف سے ی تک پڑھا ہے انہوں نے تو مجھے اس سے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ میں نے فوراً! جناب سید غلام رضا سعیدی سے فون پر رابطہ کیا اور ان سے اس مسئلہ کی بابت دریافت کیا" وہ بھی حیران ہوکر بولے اس نوعیت کا مسئلہ میری نظر سے بھی گزرا۔ میں نے کہا اتنے بڑے دانشور کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ تو نہیں بولنا چاہیے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد انہوں نے مجھ سے رابطہ کر کے کہا کہ جی مجھے یاد آ گیا دراصل بات یہ ہے

کہ ہندوستان میں دو شخص تھے ایک کا نام جعفر اور دوسرے کا نام صادق جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا کہ ان دو اشخاص نے انگریزوں کے مفادات کی خاطر کام کر کے اسلامی تحریک کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ جناب علامہ اقبال نے اپنی کتاب میں ان دونوں افراد کی مذمت کی ہے

میرے خیال میں جب بھی غلط فہمی ہوتی ہے تو اسی طرح کی ہوتی ہے۔ پھر میں نے وہ کتاب منگوائی اس کا مطالعہ کیا تو حیران رہ گیا کہ اقبال کیا کہنا چاہتے ہیں اور سمجھنے والوں نے کیا سمجھا؟ واقعتاً جہاں برے لوگ ہیں وہاں اچھے بھی موجود ہیں علامہ اقبال نے یوں کہا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ دین ننگ جہاں ننگ وطن

یعنی جعفر بنگالی اور صادق دکنی نے دین اور وطن کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

اس لئے یہی لوگ ملک وقوم اور دین کے لئے ننگ و عار ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام بنگال یا دکن کے رہنے والے تو نہیں تھے کتنی غلط بات کہی ہے اس شخص نے جس نے علامہ اقبال جیسے دانشور کے بارے میں اس قسم کی تہمت لگائی ہے۔ اس کے بعد جب ہم نے تاریخی ریسرچ کی تو پتہ چلا کہ جب انگریزوں نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو وہاں کے دو شیعہ مجاہدوں نے ان کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کیا ان میں سے ایک کا نام سراج الدین تھا اور دوسرے کا نام ٹیپو سلطان تھا۔ سراج الدین جنوبی ہندوستان اور ٹیپو سلطان شمالی ہندوستان میں تھے۔ علامہ اقبال نے ان دو سپوتوں کی بہت زیادہ تعریف کی۔ انگریزوں نے سراج الدین کی حکومتی مشینری میں جعفر نامی شخص کو تیار کیا اس نے سراج الدین کو اندرونی طور پر کمزور کیا اور ٹیپو سلطان کی حکومت میں صادق نامی شخص کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا

گیا۔ جس کے نتیجہ میں انگریز ایک سو سال تک ہندوستان پر مسلط رہا۔ شیعہ حضرات سراج الدین اور ٹیپو سلطان کا اس لئے احترام کرتے ہیں یہ دونوں بہادر شیعہ تھے۔ سنی حضرات اس لئے احترام کرتے ہیں کہ یہ دونوں مسلم قوم کے ہیرو تھے۔ ہندو ان کا اس لے احترام کرتے ہیں کہ یہ مجاہد قومی ہیرو تھے۔ لیکن جعفر و صادق نامی اشخاص سے ہندوستان و پاکستان کا ہر فرد اس لئے نفرت کرتا ہے کہ ان دونوں غداروں نے ملک و قوم کے ساتھ غداری کی تھی۔

ایک روز میں نے سوچا کہ آپ لوگ علامہ اقبال کے اشعار اکثر اوقات بلکہ زیادہ تر اپنی محافل و مجالس میں پڑھتے ہیں اس عظیم شاعر نے امام حسین علیہ السلام کی شان میں کتنے اچھے اور عمدہ شعر کہے ہیں۔ آپ کے مذہبی حلقوں میں کچھ لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا گالیاں دی ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اقبال نے تو جعفر بنگالی اور صادق دکنی کے منافقانہ رویے کی وجہ سے ان کی مذمت کی ہے۔ میں حقیقت حال کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھی کتنے سادہ مزاج ہیں کہ اتنی بڑی بات اتنے آسان لفظوں میں کہہ دی۔ علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے جلیل القدر شاعر ہیں۔ ہم سب کو ان کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کی طویل اسلامی خدمت پر انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ آئندہ کوئی شخص بھی ان کے بارے میں اسی طرح کی کوئی بات کرے تو اس پر ہرگز اعتماد نہ کریں۔

امیر معاویہ نے ایک مرتبہ شام میں بدھ کے روز نماز جمعہ کا اعلان کر دیا، چنانچہ بدھ کے دن نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اس پر کسی ایک شخص نے اعتراض نہ کیا۔ امیر شام نے اپنے ایک جاسوس سے کہا کہ علی علیہ السلام کے پاس جا کر کہو کہ میں ایک ہزار آدمی مسلح لے کر آپ کے پاس آ رہا ہوں کہ آپ نے بدھ اور جمعہ کا فرق کیوں نہیں بتایا۔

اب میں آپ کو ختم کر دوں گا۔ اب حسینیہ ارشاد بھی گناہگار ہو گیا ہے کہ ایک روز اس میں فلسطینیوں کے حقوق اور کمک کے لئے اس میں گفتگو ہوئی ہے" آپ تو بخوبی جانتے ہیں ہمارے وطن عزیز ایران میں یہودیوں کی بڑی تعداد موجود ہے" یہ لوگ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں" اور انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض مسلمان ان یہودیوں کے ایجنٹ ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں کہ حسینیہ ارشاد (امام بارگاہ) کے خلاف اخبارات میں کوئی بیان نہ چھپا ہو۔

میں یہاں پر صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر رکھیں ہر کام سوچ سمجھ کر کریں۔ اس ملک اور دوسرے اسلامی ممالک میں یہودی اور ان کے ایجنٹ سرگرم عمل ہیں۔ ان کے پاس وسائل کی فراوانی ہے۔ اس لئے یہ بدبخت کسی نہ کسی حوالے سے مسلمانوں کے خلاف مصروف کار رہتے ہیں۔ نہروان کے خوارج کی تاریخ دوبارہ نہ دہرانی پڑے۔ آخر کب تک ہم اسلام کا نام لے کر مسلمانوں کے سر قلم کرتے رہیں گے؟ ہمیں ان محافل ومجالس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ہر سال ایک جگہ پر اکٹھے ہو کر علی علیہ السلام کے نام پر جلسہ منعقد کرتے ہیں؟ اس لئے کہ علی علیہ السلام کی پاک و پاکیزہ زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ اپنے سامنے رکھ کر ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکیں۔

ہمیں سیرت علی علیہ السلام کو نمونہ عمل بنانا چاہیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ حضرت علی علیہ السلام نے کس طرح خوارج سے مقابلہ کیا؟ انہوں نے خشک مقدس ملاؤں کے خلاف کس انداز میں نبرد آزمائی کی؟ انہوں نے منافقوں کو کس طرح پامال کیا؟ اور جہالت کے خلاف کس طرح جنگ لڑی؟ علی علیہ السلام کو جاہل شیعہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علی علیہ السلام کو ایسے شیعہ نہیں چاہیئے کہ جو یہودیوں کے ایجنٹوں کے پروپیگنڈے پر عمل کرتے ہوئے کہیں کہ اقبال پاکستانی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو گالی دی ہے۔ اور یہ بات پورے

ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ اقبال کو ناصبی تک کہا گیا۔ حالانکہ وہ عظیم شخص اہلبیت اطہار علیہم السلام کے مخلص ترین عقیدت مندوں میں سے تھا۔ لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کہ سنی سنائی بات کو اتنا اوپر لے جاتے ہیں کہ حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کسی شخص کو اتنی توفیق نصیب نہ ہوئی کہ پاکستانی سفارت خانے یا کسی اور جگہ سے کتاب منگوا کر اس کا مطالعہ کرے۔ علی علیہ السلام کو اس طرح کے شیعہ کی ضرورت نہیں۔ علی علیہ السلام اس سے اظہار نفرت کرتا ہے۔

اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھول کر رکھیں۔ جب بھی کوئی بات سنیں اس پر فوراً یقین نہ کریں۔ جن باتوں اور خبروں سے بدگمانیاں جنم لیتی ہوں وہ معاشرہ کے لئے بے حد خطرناک ہوتی ہیں۔ جب آپ کسی بات کی تحقیق کر چکیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر جو چاہیں بات کریں۔ لیکن تحقیق اور ثبوت کے بغیر کوئی بات نہ کریں۔

عبدالرحمٰن ابن ملجم آتا ہے علی علیہ السلام کو قتل کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ اس وقت کس قدر افسوس کرتا ہے۔ پشیمان ہوتا ہے۔ ایک خارجی کی ایک رباعی ہے اس کے پہلے دو شعر پیش کرتا ہوں وہ کہتا ہے۔

یا ضربة من تقی ما اراد بها
الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

" یعنی اس پرہیزگار شخص ابن ملجم (نعوذ باللہ) کی ضربت کا کیا کہنا کہ اس کا مطمع نظر رضائے خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر تمام لوگوں کے اعمال ایک ترازو میں رکھے جائیں اور ابن ملجم کی ایک ضربت ایک ترازو میں رکھی جائے تو اس وقت آپ دیکھیں گے کہ پوری انسانیت میں ابن ملجم سے اچھا کام کسی نے نہیں کیا ہوگا" نعوذ باللہ آپ اندازہ فرمائیں کہ جہالت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرتی ہے۔ کہ ایک شخص نے اسلام کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم ومہربان امامؑ کے قاتل کو کس قدر عمدہ القابات سے یاد کرتا ہے؟

شہادت حضرت علی علیہ السلام

ابن ملجم ان نو (۹) آدمیوں میں سے ایک ہے جو خشک مقدس تھے۔ یہ لوگ مکہ آتے ہیں اور آپس میں عہد و پیمان کرتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں تین آدمی (علی علیہ السلام، امیر شام، عمرو عاص) خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کو قتل کر دیا جائے۔ ابن ملجم حضرت علی علیہ السلام کے قتل کیلئے نامزد کیا جاتا ہے۔ حملے کا وقت انیسویں ماہ رمضان کی رات طے پایا۔ آخر اس رات طے کرنے کی کیا وجہ ہے؟ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ نادانی کی انتہا دیکھئے یہ رات انہوں نے اس لئے مقرر کی کہ چونکہ یہ عمل بہت بڑی عبادت ہے اسلئے اس رات کو انجام دیا جائے، تو اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ابن ملجم کوفہ آتا ہے اور کافی دنوں تک اسی رات کا انتظار کرتا رہا اس عرصہ میں وہ "قطام" نامی خارجی عورت سے اس کی آشنائی ہو جاتی ہے۔ اس سے شادی کی پیشکش کرتا ہے، وہ کہتی ہے میں شادی کیلئے حاضر ہوں لیکن اس کا حق مہر بہت مشکل ہے۔ اس نے کہا میں دینے کو تیار ہوں وہ عورت بولی تین ہزار درہم" وہ بولا کوئی حرج نہیں۔ ایک غلام، وہ بھی ملے گا، ایک کنیز وہ بھی ملے گی۔ میری چوتھی شرط یہ ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب کو قتل کیا جائے پہلے تو وہ کانپ اٹھا پھر بولی خوشحال زندگی گزارنے کیلئے آپ کو یہ کام تو کرنا پڑے گا اگر تو زندہ بچ گیا تو بہتر ہے نہ بچا تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اس شش و پنج میں مبتلا رہا اور اس نے دو شعر کہے۔

ثلاثه آلاف وعبد وقينة
وقتل علی بالحسام المسمم
ولا مهر اعلیٰ من دان علا

ولا فتك الا دون فتك ابن ملجم

وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ چند چیزیں مجھ سے حق مہر میں طلب کی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جتنا بھی حق مہر زیادہ ہو وہ علی علیہ السلام سے بہتر ہے۔ میری بیوی کا حق مہر علی علیہ السلام کا خون ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ پوری دنیا میں تا قیام قیامت ایسا قتل نہیں ہے جو ابن ملجم کے ہاتھ سے علی علیہ السلام کا قتل ہوا ہے، سے بڑا ہو واقعتاً اس نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ جب علی علیہ السلام موت کے بستر پر وصیت کرتے ہیں۔ اس وقت ماحول میں عجیب وغریب کشیدگی پائی جاتی تھی۔ لوگوں کے جذبات میں شعلے لپک رہے رہے۔ ایک طرف امیر شام اور اس کے کارندے موجود تھے دوسری طرف خشک مقدس ملاؤں کا گروہ موجود تھا" ان دونوں گروپوں میں تضاد پایا جاتا تھا۔ آپ نے اپنے اصحاب اور جانثاروں سے فرمایا کہ لاتقتلو الخوارج بعدی کہ میرے بعد ان کو قتل نہ کرنا، انہوں نے مجھے تو مار ڈالا ہے تم ان کو نہ مارنا۔ اگر آپ لوگوں نے خارجیوں کا قتل عام کیا تو یہ بات امیر شام کے فائدے میں جائے گی۔ اس سے کسی لحاظ سے بھی حق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ آپ نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا:

"لا تقتلو الخوارج من بعدی فليس من طلب الحق فاخطاه كمن الباطل فادركه"

"یعنی میرے بعد خوارج کو قتل نہ کرنا اس لئے کہ جو حق کا طالب ہو اور اسے نہ پا سکے وہ ایسا نہیں ہے کہ جو باطل ہی کی طلب میں ہو اور پھر اسے بھی پالے"

علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم رقمطراز ہیں کہ قتل خوارج سے روکنے کی وجہ یہ تھی

کہ چونکہ امیر المومنین علیہ السلام کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ آپ کے بعد تسلط واقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا جو جہاد کے موقعہ ومحل سے بے خبر ہوں گے اور صرف اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کیلئے تلواریں چلائیں گے اور یہ وہی لوگ تھے کہ جو امیر المومنین علیہ السلام کو برا سمجھنے اور برا کہنے میں خوارج سے بھی بڑھے چڑھے ہوئے تھے۔

لہذا جو خود گم کردہ راہ ہوں انہیں دوسرے گمراہوں سے جنگ وجدال کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ جان بوجھ کر گمراہیوں میں پڑے رہنے والے اس کے مجاز ہو سکتے ہیں کہ بھولے سے بے راہ ہو جانے والوں کے خلاف صف آرائی کریں۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد واضح طور سے اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ خوارج کی گمراہی جان بوجھ کر نہ تھی بلکہ شیطان کے بہکاوے میں آکر باطل کو حق سمجھنے لگے اور اس پر اڑ گئے اور امیر شام اور اس کی جماعت کی گمراہی کی یہ صورت تھی کہ انہوں نے حق کو حق سمجھ کر ٹھکرایا اور باطل کو باطل سمجھ کر اپنا شعار بنائے رکھا اور دین کے معاملہ میں ان کی بے باکیاں اس حد تک بڑھ گئی تہیں کہ نہ انہیں غلط فہمی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر خطائے اجتہادی کا پردہ ڈالا جا سکتا ہے جبکہ وہ علانیہ دین کی حدود توڑ دیتے تھے اور اپنی رائے کے سامنے پیغمبر ﷺ کے ارشاد کو اہمیت نہ دیتے تھے۔

چنانچہ ابن الحدید نے لکھا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ چاندی اور سونے کے برتنوں میں پینے والے پیٹ میں دوزخ کی آگ کے شعلے اٹھیں گے تو امیر شام نے کہا کہ میری رائے میں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں" اور کس طرح زیاد ابن ابیہ کو اپنے سے ملا لینے کیلئے قول پیغمبر ﷺ کو ٹھکرا کر اپنے اجتہاد کو کارفرما کرنا" منبر رسول ﷺ پر اہل بیت رسول ﷺ کو برا کہنا، حدود شرعیہ کو پامال کرنا، بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنا، اور ایک فاسق کو

مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر کے زندقہ والحاد کی راہیں کھول دینا ایسے واقعات ہیں کہ انہیں کسی غلط فہمی پر محمول کرنا حقائق سے عمداً چشم پوشی کرنا ہے۔

علی علیہ السلام کو کسی سے کینہ نہ تھا وہ ہمیشہ حق کی بات کہتے اور عدل وانصاف کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ جب ابن ملجم کو قید کر کے مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں لایا گیا وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا ابن ملجم بتا یہ کام تو نے کیوں کیا؟ کیا میں تیرا اچھا امام نہ تھا؟ علی علیہ السلام کا یہ کہنا تھا کہ عرق ندامت اس کی پیشانی اور چہرے پر بہہ پڑا۔ اس نے عرض کی یا علیؑ میں بد بخت تھا اور یہ بہت بڑا گناہ کر بیٹھا۔ لیکن ایک بار اس نے کرخت لہجہ کے ساتھ گفتگو کی اور کہا کہ یا علیؑ یہ تلوار خریدتے وقت اللہ تعالی سے عہد کیا تھا کہ میں اس تلوار سے بدترین انسان کو قتل کروں گا (نعوذ باللہ) اور میں ہمیشہ اپنے خدا سے یہ دعا کرتا رہا کہ اس تلوار سے اس انسان کا خاتمہ کر، آپ نے فرمایا ابن ملجم اللہ نے تیری دعا قبول کر لی ہے تو اپنی اسی تلوار سے قتل ہوگا۔

علی علیہ السلام دنیا سے چلے گئے آپ کا جنازہ کوفے جیسے بڑے شہر میں موجود ہے خارجیوں کے علاوہ شہر کے جتنے بھی لوگ تھے سب کی خواہش تھی کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے جنازہ میں شرکت کریں اور وہ علی علیہ السلام کے غم میں گریہ وزاری کر رہے تھے۔ اکیسویں رمضان کی رات ہے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام، محمد بن حنفیہ علیہ السلام جناب ابو الفضل عباس علیہ السلام اور چند مومنین شاید چھ سات آدمی تھے، انہوں نے تاریکی شب میں مولا کو غسل وکفن دیا۔ امام علی علیہ السلام کی معین کردہ جگہ میں رات کی تاریکی وتنہائی اور خاموشی میں آپ کو آہوں اور سسکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اس جگہ پر کچھ انبیاء کرام بھی مدفون تھے۔ جب دوسری صبح ہوئی تب لوگوں کو علم ہوا کہ جناب ابو تراب علیہ السلام دفنائے جا چکے ہیں لیکن آپ کی قبر اطہر کے

بارے میں کسی کو علم نہ تھا یہاں تک کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت حسن علیہ السلام نے جنازہ تشکیل دے کر مدینہ روانہ کر دیا تا کہ خوارج اور دشمنان علی علیہ السلام یہ سمجھیں کہ امام کو مدینہ میں دفن کر دیا ہے۔ اور وہ قبر علی علیہ السلام کی توہین نہ کریں۔ اس زمانے میں خوارج کا قبضہ تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے فرزندان اور چند خواص کے علاوہ کسی کو خبر نہ تک تھی کہ مولا مشکل کشا علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟

یہ راز ایک سو سال تک مخفی رہا۔ بنی امیہ چلے گئے اور بنی عباس آ گئے۔ اب یہ خطرہ ٹل گیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے سب سے پہلے امام علی علیہ السلام کی قبر مبارک کی نشاندہی کی" اور علانیہ طور پر لوگوں کو بتایا کہ ہمارے جد امجد امیر المومنین علیہ السلام یہیں پر دفن ہیں۔ زیارت عاشورا کا راوی صفوان کہتا ہے کہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں کوفہ میں تھا۔ آپ ہمیں قبر علی علیہ السلام کے سرہانے لے آئے اور اشارہ کر کے فرمایا یہ ہے دادا علی علیہ السلام کی قبر اطہر۔ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم امام علی علیہ السلام کی قبر پر سایہ کا اہتمام کریں۔ بس اسی روز سے والی نجف کی آخری آرام گاہ مشہور ہوئی۔ کتنے بڑے دکھ کی بات ہے کہ علی علیہ السلام کے دشمن اس قدر کینہ پرور اور کمینہ صفت لوگ تھے کہ ایک صدی تک آپ کی قبر غیر محفوظ تھی۔

صلح حضرت امام حسن علیہ السلام

حضرت امام حسن علیہ السلام کا امیر شام کے ساتھ صلح کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو اس وقت سے لے کر اب تک زیر بحث چلا آ رہا ہے۔ امام علیہ السلام کے دور امامت میں بعض اشخاص نے "صلح امام حسن علیہ السلام پر اعتراض کیا دیگر ائمہ معصومین علیہ السلام کے ادوار میں بھی کچھ لوگ اسی طرح کے اعتراضات کرتے رہے اور یہ مسئلہ آج تک زیر بحث چلا آ رہا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے امیر شام کے ساتھ صلح کیوں کی؟ اس قسم کے افراد سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے حاکم وقت کے ساتھ مصالحت کر لی تھی اور امام حسین علیہ السلام نے یزید کے ہاتھ پر بیعت قبول نہ کی۔ اور ابن زیاد کو صاف جواب دے دیا کہ مجھ جیسا معصوم یزید جیسے فاسق و فاجر کی بیعت نہیں کر سکتا۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام چونکہ امام وقت تھے اور ان کے زمانہ امامت میں ان سے بہتر شخص اور کوئی نہیں تھا۔ یزید تو یزید وہ دنیا کے کسی بڑے شخص کی بھی بیعت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ امام وقت تھے۔

اعتراض کرنے والے حضرات اگر حقیقت حال کا مطالعہ کر لیتے تو وہ صلح امام حسن علیہ السلام پر کبھی بھی اعتراض نہ کرتے کیونکہ امام حسن علیہ السلام کی صلح اور امام حسین علیہ السلام کے قیام میں بہت بڑا فرق ہے۔ حالات اور ماحول کا بہت فرق تھا بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام چونکہ ایک صلح پسند تھے اور امام حسین علیہ السلام جنگجو تھے اس لئے ایک جگہ پر صلح ہوئی اور دوسری جگہ پر جنگ اور قتل و کشتار جیسی صورت حال پیدا ہو گئی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ان تمام اعتراضات کا ہم ایک ایک کر کے جواب دیں گے اور اس ثبوت کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے یہ دونوں شہزادے حق پر تھے انہوں نے جو جو بھی اقدام کیا

وہ بھی حق پر تھا۔

اگر امام حسن علیہ السلام "امام حسین علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے یا امام حسین علیہ السلام امام حسن علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے تو ایک جیسی صورت حال پیدا ہوتی۔ صلح حسن علیہ السلام کے وقت حالات اور طرح کے تھے اور کربلا میں زمانہ اور حالات کا رخ کچھ اور تھا۔ امام حسن علیہ السلام کے دور امامت میں اسلام کی بقاء اس خاموشی میں مضمر تھی اور کربلا میں اسلام جہاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

بقول مولانا ظفر علی خان ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میں بھی چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے اردگرد بحث کروں عام طور پر جو لوگ صلح حسنؑ اور قیام حسینؑ کے بارے میں بحث تمحیص کرتے ہیں ان کی گفتگو کا محور بھی یہی ہوتا ہے لیکن کچھ تجزیہ نگار اپنی پیٹری سے اتر جاتے ہیں۔ وہ کہنا کچھ چاہتے ہیں کہہ کچھ اور دیتے ہیں۔ دراصل اسلام میں جہاد کا مسئلہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اگر ان دونوں مسئلوں کو دیکھا جائے تو ان دونوں ہی میں فلسفہ جہاد عملی طور پر نمایاں نظر آئے گا۔ اسی جہاد کو مدنظر رکھتے ہوئے امام حسن علیہ السلام نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور اسی جہاد کی خاطر امام حسین علیہ السلام نے میدان جنگ میں آ کر صرف اپنا نہیں بلکہ اسلام وقرآن کا دفاع کیا۔ ہماری بحث کا محور بھی یہی بات رہے گی کہ امام حسن علیہ السلام نے حاکم وقت کے ساتھ صلح کی تو کیوں کی اور امام حسین علیہ السلام میدان جہاد میں یزیدی فوجوں سے نبرد آزما ہوئے تو کیوں ہوئے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صلح

جب ہم غور وخوض کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ صلح صرف امام حسن علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ پیغمبر اسلام کے دور رسالت سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے ابتدائی سالوں سے لے کر آخر مدت تک مکہ میں رہے لیکن جب آپ دوسرے سال میں مدینہ تشریف لائے تو آپ کا رویہ مشرکین کے ساتھ انتہائی نرم اور ملائم تھا۔ حالانکہ مشرکین نے حضور پاک کو اور دیگر مسلمانوں کو بہت زیادہ اذیتیں دی تھیں اور ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ آخر مسلمانوں نے تنگ آ کر حضور سے جنگ کی اجازت چاہی اور عرض کی سرکار آپ ہمیں صرف ایک مرتبہ جنگ کی اجازت مرحمت فرما دیں تو ہم ان کافروں، مشرکوں کو ایسا یادگار سبق سکھائیں کہ یہ آئندہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے آپ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی اور ان کو امن وآشتی اور صبر وتحمل کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کی۔

آپ نے فرمایا لڑنے جھگڑنے سے صورت حال مزید خراب ہوگی اس لئے بہتر یہ ہے کہ خاموش رہا جائے۔ اگر کسی کو اس حالت میں نہیں رہنا ہے تو وہ سرزمین حجاز سے حبشہ کی طرف ہجرت کر سکتا ہے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

"یعنی جن (مسلمانوں) سے (کفار) لڑا کرتے تھے چونکہ وہ (بہت)

ستائے گئے اس وجہ سے انہیں بھی (جہاد کی) اجازت دے دی گئی اور خدا
توان لوگوں کی مدد پر یقیناً قادر (وتوانا) ہے" (سورہ حج، ۳۹)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلام جنگ کا دین ہے یا صلح کا؟ اگر صلح کا دین ہے تو ہمیشہ اسی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ دین کا کام تو لوگوں کو نیک کام کی دعوت دینا ہے۔

اگر اسلام جنگ کا دین ہوتا تو پھر رسول خدا نے مکہ میں تیرہ (۱۳) سال تک جنگ کی اجازت کیوں نہیں دی دراصل بات یہ ہے کہ اسلام وقت اور حالات کو دیکھتا ہے اگر صلح کا مقام ہو تو حکم دیتا ہے کہ جنگ نہ کرو اور جنگ اور دفاع کی نوبت آجائے تو پھر سکوت کو جائز قرار نہیں دیتا۔ ہم رسول خدا کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں کچھ مقامات پر کفار و مشرکین کے ساتھ جنگیں کر رہے ہیں اور بعض مقامات پر صلح کی قراردادوں پر دستخط کر رہے ہیں جیسا کہ حدیبیہ کے مقام پر آپ مشرکین مکہ سے صلح کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ مشرک آپ کے سخت ترین دشمن تھے۔ یہاں پر صحابہ کرام نے بھی صلح پر دستخط کیے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ یہ عہد و پیمان کر رہے ہیں کہ ان کے ذاتی امور میں ان کو آزاد چھوڑا جائے گا۔ یہ فرمایئے اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

حضرت علی علیہ السلام اور صلح

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک جگہ پر لڑتے ہیں اور دوسری جگہ پر نہیں لڑتے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت کا مسئلہ پیدا ہو جانا اور خلافت دوسرے لے جاتے ہیں علی علیہ السلام اس مقام پر جنگ نہیں کرتے، تلوار اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے اور فرماتے ہیں کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں نہ لڑوں اور نہ ہی مجھے لڑائی میں حصہ لینا چاہیے۔ دوسروں کی طرف سے جوں جوں سختی پریشانی بڑھتی جاتی ہے آپ اس قدر نرم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ حضرت زہرا علیہا السلام کو پوچھنا پڑتا ہے کہ

"مالك يا ابن ابي طالب اشتملت شملة الجنين و قعدت حجرة الطنين" [1] اے ابوطالبؑ کے بیٹے آپ کی حالت جنین کی طرح کیوں ہوگئی ہے کہ جو شکم مادر میں ہاتھ اور پاؤں کو سمیٹ لیتا ہے آپ اس شخص کی مانند ایک کمرہ میں گوشہ نشین ہو کر رہ گئے ہیں کہ جو لوگوں کے شرم کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکلتا؟ آپ وہی تو ہیں کہ آپ کے سامنے میدان جنگ میں بڑے بڑے پہلوانوں کے پتے پانی ہو جایا کرتے اور آپ کو دیکھ کر بڑے بڑے جری بہادر جرنیل بھاگ جاتے تھے۔ اب آپ کی حالت یہ ہے کہ یہ ٹڈی دل لوگ آپ پر غالب آگئے ہیں آخر کیوں"؟

حضرت فرماتے ہیں اے میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری بیٹی! اس وقت میری ذمہ داری اس طرح کی تھی اور اب میرا فریضہ یہ ہے کہ میں چپ رہوں، خاموش رہوں، صبر و تحمل سے کام لوں۔ یہاں تک کہ پچیس سال اسی حالت میں گزر جاتے

[1] الاحتجاج طبرسی، ج ۱، ص ۱۰۷۔

ہیں۔ ان پچیس (۲۵) سالوں کی مدت میں علی ؑ خاموش رہے۔ پھر ایک وقت
ایسا بھی آتا ہے کہ حضرت عثمان غنی ؓ قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ حالات بدل جاتے
ہیں، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم آپ کے درعصمت پر آتا ہے ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں
جو علی ؑ کو قتل عثمان ؓ میں ملوث کرنا چاہتے ہیں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو کہتے ہیں
مولا آپ مسند خلافت پر تشریف لے آیئے کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ سے تقاضا کرتے
ہیں کہ یا علی ؑ قاتلین عثمان ؓ کو پکڑ کر قرار واقعی سزا دی جائے آخر وہی وقت آ گیا
جس کی نشاندہی آپ نے نہج البلاغہ میں کی ہے۔ آپ نے حضرت عثمان ؓ سے کہا تھا
کہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی شخص آپ کو قتل کر کے مسلمانوں کے درمیان عجیب صورت حال
پیدا ہو کر دے ایک طرف عثمان ؓ کے مخالفوں کا گروہ تھا دوسری طرف حضرت
عثمان ؓ تھے" لیکن آپ نے ہمیشہ عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا۔

قارئین کرام! آیۃ اللہ شہید مطہری (رح) اور علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم
کی عبارتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اس لئے ہم مفتی صاحب قبلہ کی عبارت پیش
کرتے ہیں وہ نہج البلاغہ کے صفحہ نمبر ۱۱۴ پر رقمطراز ہیں کہ جب حضرت عمر ؓ ابو
لولو کے ہاتھوں سے زخمی ہوئے اور دیکھا کہ اس کاری زخم سے جانبر ہونا مشکل ہے تو
آپ نے انتخاب خلیفہ کیلئے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی جس میں علی ابن ابی طالب،
عثمان ؓ ابن عفان، عبدالرحمٰن ابن عوف، زبیر ابن عوام، سعد ابن ابی وقاص اور طلحہ
ابن عبید اللہ کو نامزد کیا اور ان پر یہ پابندی عائد کر دی کہ وہ انکے مرنے کے بعد تین دن
کے اندر اندر اپنے میں سے ایک کو خلافت کے لئے منتخب کر لیں اور یہ تینوں دن امامت
کے فرائض انجام دیں۔ ان ہدایت کے بعد ارکان شوریٰ میں سے کچھ لوگوں نے ان
سے کہا کہ آپ ہمارے متعلق جو خیالات رکھتے ہوں ان کا اظہار فرماتے جائیں تاکہ
انکی روشنی میں قدم اٹھایا جائے۔ اس پر آپ نے فرداً فرداً ہر ایک کے متعلق اپنی زریں

رائے کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ سعد کے متعلق کہا کہ وہ درشت خو اور تند مزاج ہیں اور
عبدالرحمن اس امت فرعون ہے اور زبیر خوش ہوں تو مومن اور غصہ میں ہوں تو کافر اور
طلحہ غرور و نخوت کا پتلا ہے اگر انہیں خلیفہ بنایا گیا تو خلافت کی انگوٹھی اپنی بیوی کے ہاتھ
میں پہنا دیں گے اور حضرت عثمان ؓ کو اپنے قوم و قبیلہ کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا
رہے علی ؑ تو وہ خلافت پر رکے ہوئے ہیں۔

اگر چہ میں جانتا ہوں کہ ایک وہی ایسے ہیں جو خلافت کو صحیح راہ پر چلائیں
گے مگر اس کے اعتراف کے باوجود آپ نے مجلس شوریٰ کی تشکیل ضروری سمجھی اور اس
کے انتخاب ارکان اور طریق کار میں وہ تمام صورتیں پیدا کر دیں کہ جس سے خلافت کا
رخ ادھر ہی بڑھے جدھر آپ موڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی بہت سمجھ بوجھ سے کام
لینے والا باآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس میں حضرت عثمان ؓ کی کامیابی کے تمام
اسباب فراہم تھے اس کے ارکان کو دیکھئے تو ان میں ایک حضرت عثمان ؓ کے بہنوئی
عبدالرحمٰن بن عوف ہیں اور دوسرے سعد بن وقاص ہیں جو امیر المومنین ؑ سے کینہ
وعناد رکھنے کے باوجود عبدالرحمٰن کے عزیز و ہم قبیلہ بھی ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک
کو بھی حضرت عثمان ؓ کے خلاف تصور نہیں کیا جا سکتا، تیسرے طلحہ بن عبید اللہ تھے
طبری وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طلحہ اس موقعہ پر مدینہ میں موجود نہ تھے
لیکن ان کی عدم موجودگی حضرت عثمان ؓ کی کامیابی میں سدراہ نہ تھی بلکہ وہ موجود بھی
ہوتے، جیسا کہ شوریٰ کے موقعہ پر پہنچ گئے تھے اور انہیں امیر المومنین ؑ کا ہمنوا بھی
سمجھ لیا جائے تب بھی حضرت عثمان ؓ کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ تھا کیونکہ حضرت
عمر ؓ کے ذہن رسا نے طریقہ کار یہ تجویز کیا تھا" کہ اگر دو ایک پر اور دو ایک پر
رضامند ہوں تو اس صورت میں عبداللہ بن عمر کو ثالث بنایا جائے جس فریق کے متعلق وہ
حکم لگائے وہ فریق اپنے میں سے خلیفہ کا انتخاب کرے اور اگر وہ عبداللہ ابن عمر کے

فیصلے پر رضا مند نہ ہوں تو تم اس فریق کا ساتھ دو جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہو اور دوسرے لوگ اگر اس سے اتفاق نہ کریں تو انہیں اس متفقہ فیصلے کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے قتل کر دو۔[1]

اس مقام پر عبداللہ ابن عمر ؓ کے فیصلہ پر نارضا مندی کے کیا معنی جب کہ انہیں یہ ہدایت کر دی جاتی ہے کہ وہ اسی گروہ کا ساتھ دیں جس میں عبدالرحمٰن ہوں۔ چنانچہ عبداللہ کو حکم دیا کہ اے عبداللہ اگر قوم میں اختلاف ہو تو تم اکثریت کا ساتھ دینا اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو تم اس فریق کا ساتھ دینا جس میں عبدالرحمٰن ہوں۔ اس فہمائش سے اکثریت کی ہمنوائی سے بھی یہی مراد ہے کہ عبدالرحمٰن کا ساتھ دیا جائے کیونکہ دوسری طرف اکثریت ہو ہی کیونکر سکتی تھی جب کہ ابوطلحہ انصاری کی زیر قیادت پچاس خونخوار تلواروں کو حزب مخالف کے سروں پر مسلط کر کے عبدالرحمٰن کے اشارہ چشم و آبرو پر جھکنے کیلئے مجبور کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ امیر المومنین ؑ کی نظروں نے اس وقت بھانپ لیا تھا کہ خلافت عثمان ؓ کی ہوگی جیسا کہ آپ کے اس کلام سے ظاہر ہے جو ابن عباس سے مخاطب ہو کر فرمایا خلافت کا رخ ہم سے موڑ دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہوا فرمایا کہ میرے ساتھ حضرت عثمان ؓ کو بھی لگا دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اکثریت کا ساتھ دو اور اگر دو ایک پر اور دو ایک پر رضا مند ہوں تو تم ان لوگوں کا ساتھ دو جن میں عبدالرحمٰن بن عوف ہو۔ چنانچہ سعد تو اپنے چچیرے بھائی عبدالرحمٰن کا ساتھ دے گا اور عبدالرحمٰن تو حضرت عثمان ؓ کا بہنوئی ہوتا ہی ہے۔

بہرحال حضرت عمر ؓ کی رحلت کے بعد یہ اجتماع ہوا اور دروازہ پر ابوطلحہ

[1] تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۹۴

انصاری پچاس آدمیوں کے ساتھ شمشیر بکف آ کھڑا ہوا۔ طلحہ نے کارروائی کی ابتداء کی اور سب کو گواہ بنا کر کہا کہ میں اپنا حق رائے دہندگی حضرت عثمان ؓ کو دیتا ہوں۔ اس پر زبیر کی رگ حمیت پھڑکی (کیونکہ ان کی والدہ حضرت کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب تھیں) اور انہوں نے اپنا حق رائے دہندگی عبدالرحمٰن کے حوالے کر دیا۔ اب مجلس شوریٰ کے ارکان صرف تین رہ گئے جن میں عبدالرحمٰن نے کہا کہ میں اس شرط پر اپنے حق سے دستبردار ہونے کیلئے تیار ہوں کہ آپ دونوں (علی ابن ابی طالب ؑ اور عثمان ؓ ابن عفان) اپنے میں سے ایک کو منتخب کر لینے کا حق مجھے دینے دیں یا آپ میں سے کوئی دستبردار ہو کر یہ حق لے لے۔

یہ ایک ایسا جال تھا جس میں امیر المومنین ؑ کو ہر طرف سے جکڑ لیا گیا تھا کہ یا تو اپنے حق میں دستبردار ہو جائیں یا عبدالرحمٰن کو اپنی من مانی کارروائی کرنے دیں۔ پہلی صورت آپ کیلئے ممکن ہی نہ تھی کہ حق سے دستبردار ہو کر عثمان ؓ یا عبد الرحمٰن کو منتخب کریں۔ اس لئے آپ اپنے حق پر جمے رہے اور عبدالرحمٰن نے اپنے کو اس سے یہ اختیار سنبھال لیا اور امیر المومنین ؑ سے مخاطب ہو کر کہا، میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتاب خدا، سنت رسول اور حضرت ابوبکر کی سیرت پر چلیں" آپ نے کہا نہیں میں اللہ کی کتاب، رسول کی سنت اور اپنے مسلک پر چلوں گا۔ تین مرتبہ دریافت کرنے کے بعد جب یہی جواب ملا تو حضرت عثمان ؓ سے مخاطب ہو کر کہا کیا آپ کو یہ شرائط منظور ہیں۔ ان کے لئے انکار کی کوئی وجہ نہ تھی انہوں نے ان شرائط کو مان لیا اور ان کی بیعت ہوگئی۔ بہرصورت امیر المومنین ؑ نے فتنہ و فساد کو روکنے اور حجت تمام کرنے کیلئے اس میں شرکت گوارا فرمائی تا کہ ان کے ذہنوں پر قفل پڑ جائیں اور یہ نہ کہتے پھریں کہ ہم تو انہی کے حق میں رائے دیتے مگر خود انہوں نے شوریٰ سے کنارہ کشی کر لی اور ہمیں موقع نہ دیا کہ ہم آپ کو منتخب کرتے۔)

آیۃ اللہ شہید مطہریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہاں پر ایسی سیاست اختیار کیوں کی؟ تو آپ نے فرمایا:

"واللہ لاسلمن ما سلمت امور المسلمین ولم یکن فیھا جور الا علی خاصۃ"

" خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم ونسق برقرار رہے گا اور صرف میری ہی ذات ظلم وجور کا نشانہ بنتی رہے گی میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا۔" (نہج البلاغہ، ۷۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رحلت کے بعد لوگ آپ کے در دولت پر آ کر بیعت کرتے ہیں۔ یہ امیر شام کا دور ہے۔ ماحول بدل جاتا ہے یہاں پر حضرت علی علیہ السلام ناکثین، قاسطین، مارقین، یعنی اصحاب جمل، اصحاب صفین، اصحاب نہروان سے جنگ کرتے ہیں۔ اور یہ جنگ طول پکڑ جاتی ہے۔ چنانچہ صفین کے بعد عمر وعاص اور امیر شام کی عیارانہ ومکارانہ پالیسی کام دکھا جاتی ہے۔ خوارج قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کر کے آواز بلند کرتے ہیں کہ اس جنگ میں قرآن مجید کے فیصلہ کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ قرآن کو نوک نیزہ پر دیکھ کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ بندی کا مطالبہ کرنے والے حق پر ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ اب مولا علی علیہ السلام کو مصلحت کے مطابق خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

آپ نے مجبور ہو کر حکم کو تسلیم کیا۔ آپ نے فرمایا حکم قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ کریں۔ دراصل یہ ایک طرح کی منافقانہ چال تھی یہ لوگ مولا علی علیہ السلام کو وقتی طور پر خاموش کرنا چاہتے تھے۔ عمر وعاص اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا اس نے ابو موسیٰ کو بھی دھوکہ دیا لیکن حقیقت بعد میں کھل کر سامنے آ گئی کہ ان دونوں نے ایک

دوسرے کے ساتھ دھوکہ کیا ان میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ دو ہزار افراد پر مشتمل لشکر میری وجہ سے پیچھے ہٹا ہے کہ نوبت گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ دراصل یہ خود ساختہ حکمت کا اعجاز تھا۔ اب اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ اگرچہ مولا نے خوارج کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنگ بندی کا اعلان کر دیا زیادہ سے زیادہ یہی ہو جاتا کہ آپ قتل ہو جاتے یا آپ کے بیٹوں میں سے ایک شہید ہو جاتا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ وہ شہید ہو جاتے۔ آپ نے حدیبیہ کے مقام پر صلح کیوں کی؟ جس طرح کربلا میں امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے" رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شہید ہو جاتے؟ پھر امیر المومنین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خاموشی اختیار کیوں کی؟ زیادہ سے زیادہ آپ شہید ہو جاتے؟ آپ نے حکومت کو کیوں تسلیم کیا؟ آپ کو چاہیے تھا کہ جان کی پروا کیے بغیر جنگ جاری رکھتے؟ مسئلہ امام حسن علیہ السلام کی صلح اور امام حسین علیہ السلام کی جنگ پر ختم نہیں ہوتا بلکہ بات باقی آئمہ طاہرین علیہم السلام تک بھی پہنچتی ہے۔ میں ان تمام سوالات، ابہامات کا ایک ایک کر کے جواب دوں گا۔ سب سے پہلے میں آپ کیلئے کتاب جہاد میں فقہ کے ایک باب کو بیان کرتا ہوں تا کہ آپ کو میری گفتگو کے دیگر نکات بخوبی سمجھ میں آسکیں۔

فقہ جعفریہ میں جہاد کا تصور

بلا شبہ اسلام جہاد کا دین ہے اور یہ چند مقامات پر واجب ہے۔ ان میں سے ایک ابتدائی جہاد ہے یعنی یہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب مدمقابل غیر مسلمان ہوں۔ خاص طور پر اگر وہ مشرک ہوں۔ اگر کوئی مشرک مسلمانوں پر حملہ کرتا ہے تو اس کو منہ توڑ جواب دیا جائے ایسا جہاد بالغ، عاقل اور آزاد شخص پر واجب ہے۔ اور مجاہد مرد ہونا ضروری ہے۔ عورتوں کیلئے جہاد میں حصہ لینا ضروری نہیں ہے۔ اس قسم کے جہاد میں امام علیہ السلام یا ان کے نائب سے اجازت لینا ضروری ہے۔ شیعہ فقہ کے نزدیک اس وقت ایک حاکم شرعی اپنی طرف سے جہاد ابتدائی کو اپنی طرف سے شروع نہیں کرسکتا۔ دوسرا مقام یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو کافروں، مشرکوں کی طرف سے خطرہ یا وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کے خلاف دست درازی کرے یا ایک ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کی زمین پر قبضہ کرنا چاہے یا قبضہ کر چکا ہو یا اس قسم کا کوئی ناجائز اقدام کرے تو اس صورت میں عورت مرد، چھوٹے بڑے، آزاد غلام پر جہاد میں شرکت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس جہاد میں امام علیہ السلام یا ان کے نائب سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔
یہ تمام شیعہ فقہاء کا متفقہ طور پر فتویٰ ہے اس سلسلے میں شہید ثانی علیہ الرحمہ کی فقہی رائے پیش خدمت ہے جناب محقق کی فقہ پر ایک کتاب ہے۔ اس کا نام ہے شرائع الاسلام، اس کتاب کو شیعہ علماء میں بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جناب شہید ثانی نے "مسالک الافہام" کے نام سے اس کی شرح کی ہے، بہت ہی عمدہ شرح ہے۔ جناب شہید ثانی کا شمار شیعوں کے صف اول کے فقہاء میں سے ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی کافر یا مشرک یا کوئی بے دین شخص مسلمانوں پر حملہ کرتا ہے تو تمام

مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ سب مل کر جہاد میں بھرپور طریقے کے ساتھ حصہ لیں۔
آپ اسرائیل کو لے لیجئے اس نے مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ کر رکھا ہے اور آئے روز فلسطینی مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ تو یہاں پر دنیا بھر کے تمام مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسرائیل کی ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف عملی طور پر جہاد میں شریک ہوں" یہاں پر امام علیہ السلام کی اجازت کی شرط نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک جو اسلامی ملک کی حمایت کرسکتے ہیں کریں۔
یہ سب کچھ جہاد کے زمرے میں آجاتا ہے۔ جناب شہید ثانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ولا يختص بمن قصدوا من المسلمين بل يجب على من علم بالحال النهوض اذا لم يعلم قدرة المقصودين على المقاومة"

"یعنی یہ جہاد (ان لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ جن کی سرزمین، مال، جان اور ناموس غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے بلکہ یہ ہر اس مسلمان پر واجب ہے کہ جس کو دوسرے مسلمان کی اس مشکل کے بارے میں علم ہو تو اس پر جہاد واجب ہے مگر شرط یہ ہے، اگر وہ لوگ خود طاقت ور ہوں اور خود دفاع کرسکتے ہوں تو پھر یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو یہ علم ہو کہ جن مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے ان کو دوسرے مسلمانوں کی مدد کی ضرورت ہے تو پھر ہر مسلمان پر واجب ولازم ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ اپنے مظلوم بھائیوں کی ہر طرح سے بھرپور مدد کرے۔"

(مسالک الافہام، ج ۳، ص ۱۱۴)

تیسری قسم جہاد خصوصی کی ہے اس کے احکام اور عمومی جہاد کے احکام میں

فرق ہے۔ عمومی جہاد کے مسائل خاص نوعیت کے ہیں۔ اس جہاد میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو وہ شہید ہے اور غسل نہیں ہے۔ جو شخص رسمی جہاد میں مارا جائے تو اس کو اسی لباس کے ساتھ غسل دیئے بغیر اس خون کے ساتھ دفن کیا جائے۔

خون، شہیدان راز آب اولیٰ تراست
ایں گنہ از صد ثواب اولیٰ تر است

" شہید کا خون پاک ترین، خالص ترین پانی سے بہتر ہے یہ گنا کام ہزار ثواب سے بہتر ہے"۔

اصطلاح میں تیسری قسم کو جہاد کہتے ہیں لیکن اس جہاد کے احکام جہاد کی مانند نہیں ہیں۔ اس کا ثواب جہاد کے اجر کی مانند ہے۔ اس میں حصہ لینے والا شہید ہے، وہ ایسے ہے کہ اگر ایک شخص سرزمین کفر میں ہو اگر وہاں کافروں کی لڑائی دوسرے کفار کے ساتھ ہو جائے مثلاً وہ فرانس میں ہے اور فرانس اور جرمنی میں جنگ چھڑ جاتی ہے، اب ایک مسلمان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو ہر لحاظ سے بچانے کی کوشش کرے، اس کو وہاں کے لوگوں کی خاطر نہیں لڑنا چاہئے، اگر وہ جانتا ہے کہ اگر وہ دوسرے ملک کی فوجوں کے ساتھ لڑائی میں شریک نہیں ہوتا تو اس کی جان کو خطرہ ہے اگر اسی خطرہ کے پیش نظر وہ میدان جنگ میں آ کر لڑتا ہے تو شہید ہے۔ آپ اسے مجاہد کہہ سکتے ہیں، اگر چہ وہ شہیدوں جیسا حکم نہیں رکھتا۔ اس کو غسل دیا جائے گا کفن دینا پڑے گا۔

اب ایک اور صورت پیدا ہو جاتی ہے اس کے بارے میں فقہاء نے رائے دی ہے کہ اگر ایک شخص پر اس کا ایک دشمن حملہ کرتا ہے اس کی جان یا عزت کو خطرہ لاحق ہے اور اس کا یہ دشمن مسلمان ہے مثال کے طور پر ایک گھر میں سویا ہوا ہے کہ ایک چور یا ڈاکو گھس آتا ہے۔ (حاجی کلباسی نے کہا تھا کہ اگر نماز تہجد بھی پڑھتا ہو چور چور ہے،

ڈاکو ڈاکو ہے اس کے نماز روزے اور مسلمان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے) تو یہاں پر اگر اس کو جان مال اور عزت کا خطرہ ہے، تو اس کو یہاں پر دفاع کرنا چاہیے، حتی الامکان چوروں، ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہ یہ نہ سوچے کہ اگر وہ مجھ پر حملہ کرے گا تو میں اس کا جواب دوں گا۔ بلکہ اس پر لازم ہے کہ ڈاکو کو جان سے مار دے۔ اس حالت میں اگر وہ مارا جاتا ہے تو وہ شہید کے حق میں ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے فقہ کی کتب میں آپ اس کی تفصیل ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

سرکشوں سے جنگ

جہاد کے میں نے تین مقامات ذکر کیے ہیں، دو مقامات اور بھی ہیں، ایک کو سرکشوں کے ساتھ جنگ کرنے کو کہتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے ایک گروہ دوسرے گروہ کو قتل کرنا چاہتا ہے تو یہاں پر دوسرے تمام مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے تو ان کے درمیان صلح کرائیں۔ ان کو ہر حال میں لڑنے جھگڑنے سے ہٹائیں اگر ایک گروہ ان مسلمانوں کی نہ مانے اور مسلسل جنگ پر آمادگی کا اظہار کرے تو ان پر لازم ہے کہ وہ مظلوم گروہ کی حمایت کریں اور سرکش گروہ کے ساتھ مقابلہ کریں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ

" اور اگر مومنین میں سے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرادو پھر اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے تم (بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے"۔ (سورہ حجرات، ۹)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک عادل امام کے خلاف بغاوت کرتا ہے چونکہ وہ امام علیہ السلام ہے اس لئے حق پر ہے، اور امام علیہ السلام کے خلاف آنے والا جو بھی ہوگا باطل پر ہوگا۔ اب دوسرے لوگوں پر واجب ہے کہ وہ امام کا ساتھ دیں اور دشمن امام علیہ السلام کے خلاف جنگ کریں۔ جہاد کا ایک اور مرحلہ یا مقام بھی ہے اگرچہ فقہا کا اس میں کچھ اختلاف ہے وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے خونی انقلاب برپا کرنا۔

صلح اور فقہ جعفریہ

ایک مسئلہ جو کتاب جہاد میں سامنے آیا ہے وہ مسئلہ صلح ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس کو مہد یا مہادنہ کہا جاتا ہے مہادنہ یعنی مصالحت، ہدنہ یعنی صلح، صلح کا معنی یہ ہے کہ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ۔ آج کل کی اصطلاح میں ایک دوسرے کے ساتھ صلح وصفائی کے ساتھ رہنے کے عہد و پیمان کو صلح نامہ کہا جاتا ہے۔ جناب محقق شرائع الاسلام میں فرماتے ہیں کہ

"المهادنة وهي المعاقدة على ترك الحرب مدة معينة"

" یعنی جنگ نہ کرنے اور امن وآشتی کے ساتھ رہنے پر عہد و پیمان باندھنے کو صلح کہا جاتا ہے لیکن اس کیلئے ایک مدت معین کی جائے" فقہ کی کتب میں لکھا ہے کہ اگر ایک شخص مشرک ہے کہ جس سے کرنا جائز ہے اس کے ساتھ بھی صلح کی جاسکتی ہے لیکن عہد و پیمان کی ایک مدت مقرر کی جائے۔ اس کے ساتھ چھ مہینوں، ایک سال، دس سال یا اس سے زیادہ کی مدت معین کرے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کا معاہدہ کیا تھا:

"وهي جائزة اذا تضمنت مصلحة للمسلمين"

جناب محقق کہتے ہیں اگر اس میں مسلمانوں کو فائدہ پہنچے تو صلح کرنا جائز ہے حرام نہیں ہے۔"

لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اگر ایسا موقعہ ہو کہ جہاں جنگ کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسلمانوں کی سرزمین پر کفار نے حملہ کیا ہے یا مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ کر دیا جاتا ہے، تو دوسرے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ہر حالت میں اس عظیم سرزمین کو

دشمن کے قبضہ سے چھڑانا چاہیے۔ اب اگر مصلحت کے تحت وہی دشمن صلح نامہ لے آتا ہے تو آیا اس پر دستخط کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جناب محقق کا کہنا ہے کہ اگر مصلحت بھی ہو تو ایک مدت معین کرنی چاہیے۔ اس کا مقصد یہ کہ یہ صلح ایک عارضی مدت کے لئے ہو رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمان کس صلح نامہ کو قبول کریں؟ جناب محقق کہتے ہیں:

"اما لقلتهم عن المقاومة"

"یعنی جب مسلمانوں میں جنگ کرنے کی طاقت نہ ہو تو انہیں چاہیے کہ کچھ مدت کیلئے صبر کریں اور خود کو مسلح اور طاقتور بنائیں" اور

اولما یحصل به الا استظهار"

"یا وہ جنگ بندی اس لئے کر رہے ہیں کہ وہ جنگ کی مزید تیاری کرلیں"۔

اولرجاء الدخول فی الاسلام مع التربص"

"یا صلح اس امید کے ساتھ کی جا رہی ہے کہ حزب مخالف اسلام قبول کرنا چاہتا ہو یہ اس وقت ہوگا جب مخالف کافر ہوں۔"

یعنی ہم ایک مدت کیلئے دشمن سے صلح کر رہے ہیں۔ اس عرصہ کے دوران ہم روحانی وفکری لحاظ سے ان پر غلبہ حاصل کرلیں گے جیسا کہ صلح حدیبیہ میں تھا۔ اس کے بارے میں چند مطالب آگے چل کر بیان کروں گا۔

"ومتیٰ ارتفعت ذلك وكان فی المسلمین قوة علی الخصم لم یجز"

جس وقت یہ شرائط ختم ہو جائیں تو صلح برقرار رکھنا جائز نہیں ہے۔"

اب تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ بات واضح وروشن ہوگئی کہ اسلامی فقہ کے نزدیک صلح چند خاص شرائط کے تحت جائز ہے۔ اب یہ صلح خواہ ایک قرارداد کی صورت

میں ہو یا فقط زبانی طور پر جنگ بندی کا معاہدہ کیا جائے۔ یہاں پر دو باتیں قابل ذکر ہیں ایک وقت میں ہم کہتے ہیں کہ صلح کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک قرارداد باندھی جائے یہ اس جگہ پر ہوگا جب دو مخالف گروہ صلح پر آمادگی کا اظہار کریں جیسا کہ ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر عمل کرتے ہوئے امام حسن علیہ السلام نے کہا ایک موقعہ پر ہم کہتے ہیں کہ صلح یعنی جنگ نہ کرنا اور امن وآشتی کی راہ کو تلاش کرنا۔ کہا گیا ہے کہ ایک وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہم میں جنگ کی طاقت نہیں ہے تو اس وقت جنگ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے ہم جنگ نہ کریں۔ صدر اسلام میں تو اسی طرح صورت حال پیش آئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، اگر وہ اس وقت لڑتے تو اپنا ہی نقصان کرتے۔ ممکن ہے جنگ بندی اس لئے کی گئی ہو کہ اس وقفے کے دوران خود کو مضبوط اور طاقتور کرنا چاہتے ہوں یا فکری لحاظ سے ان کی سوچ بدل کر ان کو مومن ومسلمان بنانا مقصود ہو۔ اب ہم آپ کے لئے صلح حدیبیہ کے بارے میں کچھ مطالب پیش کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ امام حسن علیہ السلام کا صلح کرنے کا انداز بالکل اپنے جد امجد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا تھا۔ آپ نے حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یا ایک خاص وقت کے انتظار یا تیاری میں ہتھیار نہ اٹھائے بلکہ انتہائی حکمت ودانشمندی کے ساتھ دشمن کے ساتھ صلح کر لی۔

صلح حدیبیہ

پیغمبر اکرم ﷺ نے جب اپنے دور رسالت میں صلح کی تو آپ کے بعض صحابہ کرام نے نہ فقط تعجب کیا بلکہ سخت پریشان بھی ہوئے۔ لیکن ایک یا دو سال گزرنے کے بعد ان پر اس صلح کے ثمرات و نتائج ظاہر ہوئے تو پھر ماننے پر مجبور ہو گئے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ نے جو بھی کیا ٹھیک کیا تھا۔ چھ ہجری ہے جنگ بدر کا ایسا خونی واقعہ رونما ہوا قریش مکہ حضور ﷺ کے بارے میں اپنے دل میں سخت بغض و کینہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جنگ احد ہوئی جس طرح قریش حضور کے بارے میں سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ مسلمان اس سے بڑھ کر قریش سے نفرت کرتے تھے گویا قریش کے نزدیک ان کے سخت ترین دشمن پیغمبر اکرم ﷺ تھے اور مسلمانوں کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دشمن قریش تھے۔ ادھر ماہ ذی الحجہ کا چاند نظر آ گیا یہ ان کی اصطلاح میں ماہ حرام کہلاتا تھا۔

ان کی جاہلانہ رسم کے مطابق یہ بات طے تھی کہ ماہ حرام میں وہ اسلحہ زمین پر رکھ دیتے اور مکمل طور پر جنگ سے ہاتھ اٹھا لیتے تھے۔ عربوں میں بہت زیادہ دشمنیاں تھیں، یہی وجہ ہے اس زمانے میں قتل و کشتار بھی اتنا زیادہ تھا لیکن ماہ حرام میں اس مہینہ کے احترام میں وہ خاموش ہو جاتے۔ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی کچھ نہیں کہتے تھے، حضور رسالتمآب ﷺ نے سوچا کہ کیوں نہ ان کی جاہلانہ رسم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکہ تشریف لے جائیں اور وہاں سے عمرہ کر کے واپس تشریف لے آئیں۔ اس کے علاوہ آپ کا اور کوئی ارادہ نہ تھا اور تیاری کا اعلان فرمایا اور سات سو آدمی (ایک اور روایت کے مطابق چودہ سو آدمی جن میں آپ کے صحابہ کرام اور دیگر

لوگ بھی شامل تھے۔ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن آپ جب مدینہ سے نکلے تو حالت احرام میں آ گئے، چونکہ آپ کا حج قران تھا، اس لئے آپ کی قربانی کے جانور آپ کے آگے آگے چلے۔ قربانی کے جانوروں کے گلے میں جوتی لٹکا دی، زمانہ قدیم میں یہ رسم تھی کہ جو بھی کسی جانور کو اس حالت میں دیکھتا تو وہ خود بخود سمجھ جاتا تھا کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔ چنانچہ سات سو افراد کی مناسبت سے سات سو جانور خریدا گیا اور اسی خاص علامت کے ساتھ ان کو قافلے کے آگے اپنے ہمراہ لیا۔ تاکہ دیکھنے والے یہ بخوبی اندازہ لگا سکیں کہ یہ لوگ حج کرنے جا رہے ہیں۔ جنگ کی غرض سے نہیں آئے ہیں یہ کام اور یہ پروگرام علانیہ تھا اس لئے قریش کو سب سے حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی تو جب آپ مکہ کے قریب پہنچے تو زن و مرد چھوٹے بڑے غرضیکہ تمام قریش گھروں سے باہر نکل کر مکہ سے باہر آ گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! ہم محمد ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔

حالانکہ وہ ماہ حرام تھا اور کہا کہ ہم اس مہینے میں بھی جنگ کریں گے وہ عربوں کی اس پرانی اور مروجہ رسم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے تھے، آپ قریش کے خیموں کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی سواریوں سے نیچے اتر آئیں اور قریش سے کہا کہ تم بھی اپنے چند آدمی تیار کرو تاکہ باہمی تبادلہ خیال سے مسئلہ حل ہو سکے۔ چنانچہ قریش کے چند بزرگ آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپ ﷺ یہاں کیوں اور کس مقصد کیلئے آئے ہیں؟ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا میں حاجی ہوں اور حج ہی کی ادئیگی کیلئے آیا ہوں اس کے سوا میرا کوئی کام نہیں ہے۔ حج سے فراغت پاتے ہی فوراً واپس چلا جاؤں گا۔

ان میں سے جو بھی آتا ان کو دیکھ کر واپس چلا جاتا اگرچہ وہ مطمئن تھے پھر بھی انہوں نے بات نہ مانی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں نے یہ پکا

ارادہ کرلیا کہ وہ ہر صورت میں مکہ میں داخل ہوں گے۔ ان کا پروگرام لڑائی کا نہ تھا۔ ہاں اگر ہم پر قریش نے حملہ کیا تو ان کا دندان شکن جواب دیں گے۔ سب سے پہلے تو بیعت الرضوان کی رسم ادا کی گئی۔ اصحاب نے از سرنو آپ ﷺ کی بیعت کی، جس میں طے یہ پایا۔ اگر قریش کا نمائندہ صلح کا پیغام لے کر آیا تو ہم بھی صلح کریں گے، طرفین سے نمائندوں کی آمدورفت شروع ہوئی۔ آپ نے اپنے نمائندوں سے کہا کہ جاکر قریش سے کہہ دو کہ:

"ویح قریش اکلتھم الحرب"

افسوس ہے قریش پر جنگ نے ان کو کھالیا"

اب یہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ مجھے یہ لوگ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں جانے دیں گے تو اس سے بھی قریش کو فائدہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ہمیں آپ کی کوئی شرط قابل قبول نہیں ہے ہم صرف اور صرف صلح کیلئے قرارداد پاس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو نمائندگی کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ صلح نامہ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ امسال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آئیں اور تین روز تک قیام کر سکتے ہیں۔ آپ عمرہ کر کے واپس چلے جائیں یہ صلح نامہ اگرچہ ظاہر میں مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ تھا ان میں ایک شرط یہ تھی کہ اگر ایک قریشی دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل جائے تو قریش کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کو اپنے پاس لے آئیں۔ اگر ایک مسلمان قریش کے ساتھ مل جائے تو مسلمانوں کو حق حاصل نہ ہوگا کہ اس کو وہاں سے لے جائیں۔ آپ نے فرمایا ہماری بھی ایک شرط ہے کہ مسلمان مکہ میں آزادی کے ساتھ رہیں اور ان پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ آپ نے ایک شرط کی خاطر ان کی تمام شرائط کو قبول کرلیا، اور اس ایک شرط کی خاطر قرارداد پر دستخط کر

دیئے۔ اس سے کچھ مسلمانوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ عرض کی یا رسول اللہ یہ ہماری بے عزتی ہے کہ ہم مکہ کے نزدیک آکر واپس لوٹ جائیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟ ہم تو واپس نہیں جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا قرارداد تو یہی ہے اور اس پر طرفین کے دستخط بھی ہو چکے ہیں اب تو ہمیں عمل کرنا ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہیں پر قربانی کے جانوروں کو ذبح کر دو اور میرے سر کے بالوں کو مونڈ ڈالیجئے۔

آپ جب سر کے بال منڈوا چکے تو دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا، لیکن سخت پریشانی کے ساتھ۔ اس طرح کا عمل اس بات کی علامت تھا کہ اب یہ سب حالت احرام سے نکل چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے اور حضرت ابوبکر سے کہا کہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں کیا یہ مشرک نہیں ہیں؟ یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے؟ حضور پاکؐ نے اس سے قبل خواب میں دیکھا تھا کہ مسلمان مکہ میں داخل ہو کر مکہ کو فتح کریں گے۔ یہ دونوں بزرگ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کیا آپ ﷺ نے خواب میں نہیں دیکھا تھا کہ ہم مسلمان مکہ میں داخل ہوئے ہیں؟ فرمایا ہاں ایسا ہی تھا عرض کی پس اس خواب کی تعبیر اس طرح کیوں ظاہر ہوئی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا میں نے خواب میں یہ نہیں دیکھا کہ ہم امسال مکہ جائیں گے اور نہ ہی میں نے آپ سے اسی سال کی بات کی ہے میں نے خواب دیکھا ہے اور وہ خواب بھی سچا ہے کہ ہم مکہ ضرور جائیں گے ان دونوں بزرگوں نے عرض کی حضور یہ کوئی قرارداد تو نہ ہوئی کہ وہ لوگ ہمارے آدمی کو ساتھ لے جا سکتے ہیں اور ہم قریش میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے؟ آپ نے فرمایا اگر ایک شخص ہم میں سے وہاں جانا چاہتا ہے وہ مسلمان نہیں مرتد ہے۔ اس کی ہمیں قطعی طور پر ضرورت نہیں ہے جو مرتد ہو گیا وہ ہمارے کسی کام کا نہ رہا۔ اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہو کر ہمارے

پاس آجائے تو ہم اس سے کہیں کہ فی الحال تم مکہ جاؤ اور جس طرح بھی نبھ آئے گزارو اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور کوئی وسیلہ پیدا کرے گا۔ واقعتاً عجیب وغریب شرائط ہیں ۔سہیل بن عمر کا ایک بیٹا مسلمان تھا اور وہ اسی لشکر اسلام میں تھا اس نے بھی اس قرارداد پر دستخط کیے اس کا دوسرا بیٹا قریش کے پاس تھا، وہ دوڑتا ہوا مسلمانوں کے پاس آیا۔لیکن سہیل نے کہا کہ چونکہ اب ایگریمنٹ ہو چکا ہے اس لئے میں اس کو قریش کے پاس واپس بھیجتا ہوں اس نوجوان کا نام ابوجندل تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا تم واپس چلے جاؤ اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبب بنائے گا۔فکر نہ کرو یہ بیچارہ سخت پریشان ہوا اور چیختا چلاتا رہا، کہ مسلمان مجھے کافروں کے درمیان بے یارومددگار چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔مسلمان بھی پریشان ہوئے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اجازت دیں کہ ہم اس ایک نوجوان کو واپس نہ جانے دیں۔آپ نے فرمایا کوئی بات نہیں اسے واپس جانے دو اب یہ نوجوان قرارداد کے مطابق آزادانہ طور پر زندگی بسر کرے گا۔ان تمام نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ مکہ میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کریں۔ایک سال کی کم مدت میں اتنے زیادہ مسلمان ہوئے کہ شاید اتنے بیس سالوں کی مدت میں نہ ہوتے۔آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مکہ شہر مسلمانوں سے چھلک رہا تھا اور اس میں اسلام وقرآن کی باتیں ہو رہی تھیں، علم وعمل کے تذکرے ہو رہے تھے۔ایک بہت اچھا واقع ہے میں چاہوں گا کہ آپ کو بھی سناؤں۔ابوبصیر نامی ایک شخص مسلمان تھا۔یہ مکہ میں رہائش پذیر تھا۔ اور بہت ہی بہادر وشجاع تھا۔یہ مکہ سے فرار ہو کر مدینہ آیا۔قریش نے دو آدمیوں کو مدینہ بھیجا تا کہ قراردادوں کے مطابق اس کو مکہ لے آئیں، یہ دو شخص آئے اور کہا کہ ابو بصیر کو واپس لوٹا دیجئے۔حضرت نے فرمایا واقعی ایسا ہی ہے۔

اس نوجوان نے جتنا بھی کہا کہ یا رسول اللہ مجھے واپس نہ بھیجئے حضرت نے

فرمایا کہ چونکہ ہم ان سے وعدہ کر چکے ہیں جھوٹ بولنا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔تم جاؤ انشاء اللہ حالات بہت جلد بہتر ہو جائیں گے۔اس کو وہ اپنی حراست میں لے گئے۔یہ غیر مسلح تھا اور وہ مسلح تھے۔ذوالحلیفہ نامی جگہ پر پہنچ گئے، تقریباً یہیں سے یعنی مسجد شجرہ سے احرام باندھا جاتا ہے اور مدینہ یہاں سے سات کلومیٹر دور تھا۔یہ لوگ ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگے۔ایک شخص کے ہاتھ میں تلوار تھی، ابوبصیر نے اس سے کہا کہ یہ تلوار تو بہت خوبصورت ہے، ذرا مجھے دکھایئے تو سہی، اس نے اس سے تلوار لی اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔اس مقتول کا دوسرا ساتھی دوڑ کر مدینہ آ گیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ کوئی نیا واقعہ ہوا ہے۔اس نے عرض کی جی ہاں آپ کے آدمی نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا ہے۔کچھ لمحوں کے بعد ابوبصیر بھی وہاں پہنچ گیا عرض کی یا رسول اللہ آپ نے تو قرارداد پر عمل کر دیا۔وہ قرارداد یہ تھی کہ اگر کوئی شخص قریش سے فرار ہو کر آجائے تو آپ اس کو ان کے حوالے کر دیں میں تو خود آیا ہوں اس لئے آپ مجھے کچھ نہ کہیے آپ اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دریائے احمر کے کنارے پر آئے آپ نے وہاں پر ایک لکیر کھینچی اور اس کو مرکز قرار دیا جو مسلمان مکہ میں مشرکین کی طرف سے تکالیف برداشت کر رہے تھے ان کو پتہ چلا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن آپ نے ساحل دریا کو مرکز قرار دیا ہے، وہ ایک ایک کر کے اس جگہ پر پہنچے اور ستر (۷۰) کے لگ بھگ اکٹھے ہو گئے۔اور ایک "طاقت" بن گئے۔

قریش اب آمد ورفت نہ رکھ سکتے تھے، انہوں نے خود ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس میں کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے ان کو معاف کر دیا ہے ہم درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کو لکھیں کہ یہ لوگ مدینہ آجائیں اور ہمارے لئے رکاوٹیں کھڑی نہ کریں، ہم خود ہی اپنی قرارداد سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اس قرارداد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ لوگوں کے افکار ونظریات میں تبدیلی لائی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا جو ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے۔ اس کے بعد مسلمان مکہ میں آزادانہ طور پر رہنے لگے، اور اس آزادی کی بدولت لوگ فوج درفوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، مشرکین کی تمام تر پابندیاں ختم ہوکر آزادی میں بدل گئیں۔ یہ تھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدبرانہ سیاست اور اس سے جو دور س نتائج برآمد ہوئے۔ ان فوائد کو تو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اب آتے ہیں امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی معصومانہ حکمت عملیوں کی طرف۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر امام حسن علیہ السلام امام حسین علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے تو آپ کربلا میں ویسا ہی کرتے جیسا کہ امام حسین علیہ السلام نے کیا تھا۔ میں یہاں پر صرف ایک نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی سوال کرتا ہے کہ کیا اسلام صلح کا دین ہے یا جنگ کا دین؟ تو ہم اس کو اس طرح جواب دیں گے کہ آیئے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں دیکھتے ہیں قرآن مجید ہمیں جنگ کا حکم بھی دیتا ہے اور صلح کا بھی۔ ہمارے پاس بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جو ہمیں کافروں ومشرکوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ

"اور جو لوگ تم سے لڑیں تم (بھی) خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو" (بقرہ، ۱۹۰)

دوسری آیات بھی اس طرح کی ہیں۔ صلح کے بارے میں قرآن مجید لکھتا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل

ہو جاؤ" (انفال، ۶۱)

ایک اور جگہ پر ارشاد خداوندی ہے:

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ

"صلح تو (بہرحال) بہتر ہے۔" (نساء، ۱۲۸)

آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ اسلام کس چیز کا مذہب ہے؟ اسلام نہ صرف صلح کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کے لئے بھی وہ شرائط عائد کرتا ہے اور نہ بغیر کسی وجہ کے جنگ کو روا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے صلح اور جنگ چند خاص شرائط کے ساتھ قیام پذیر ہوں گی۔ مسلمان خواہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کا ہو یا حضرت امیر علیہ السلام کے زمانے کا یا حضرت امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور دیگر آئمہ طاہرین علیہم السلام کے دور امامت سے تعلق رکھتا ہے وہ ہر جگہ پر ایک ہدف اور مقصد کے تحت زندگی گزارتا ہے۔

اس کا ہدف اصلی اسلام اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور بازیابی ہے۔ اس کو دیکھنا چاہیے کہ یہ مقاصد صلح کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں تو صلح کی زندگی گزار دے۔ اگر کسی موقع پر اسلامی، دینی مقاصد کا تحفظ جنگ میں ہے تو اسلام کہتا ہے کہ کافروں، مشرکوں اور ظالموں کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ حقیقت میں یہ مسئلہ جنگ یا صلح کا نہیں ہے بلکہ بات حالات اور شرائط کی ہے جہاں جہاں اسلامی اہداف کا تحفظ ہو وہاں صلح یا جنگ کریں جیسی مناسبت ویسا اقدام۔ بس ہر موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ملحوظ خاطر رہے یعنی یہ اسلام کا بنیادی فلسفہ ہے۔

ایک سوال اور ایک جواب سوال

آپ نے فقہ جعفریہ کی سند امام حسن علیہ السلام کے بارے میں بیان کی ہے درست نہیں ہے، کیونکہ شیعہ فقہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی تعلیمات کے نتیجے میں وجود

میں آئی ہے۔ اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے شیعہ فقہ پر عمل کرتے ہوئے صلح کی ہے؟ جناب محقق اور دیگر علمائے شیعہ نے جو کچھ بھی کہا ہے یا بیان کیا ہے یہ سب کچھ ائمہ اطہار علیہم السلام سے لیا ہے۔ براہ کرم اس مسئلہ کی تشریح فرما دیجئے۔

جواب: آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا میں نے کب کہا کہ امام حسن علیہ السلام نے شیعہ فقہ کی پیروی کرتے ہوئے حاکم وقت کے ساتھ صلح کی ہے۔ میں نے تو فقہ کے بنیادی اصولوں کو سیرت امام علیہ السلام سے منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ہماری فقہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے فرامین سے مرتب کی گئی۔ شریعت اسلامیہ کی تشریح اور وضاحت ان بزرگ ہستیوں نے جس طرح کی ہے اتنی اور کسی نے نہیں کی۔ ہم نے فقہ کے ایک باب جہاد پر تبصرہ کیا تھا۔ جناب محقق کی عالمانہ رائے اور نقطہ نظر کو اس لئے بیان کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ صلح کے بارے میں شیعہ فقہ کیا کہتی ہے؟ بالفرض اگر آج ہمیں یا کسی اسلامی حکمران کو اس قسم کا قدم اٹھانا پڑے اور وہ ہم سے رائے مانگے تو ہم بغیر کسی توقف کے بتا سکیں کہ ہماری فقہ کیا کہتی ہے؟ اور ہمارے ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سیرت طیبہ ہمیں کیا درس دیتی ہے؟

یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان ہر وقت لوگوں سے لڑتا جھگڑتا رہے اور وہ اس کو جہاد کا نام دے۔ بلکہ جہاد اور صلح کے اپنے اپنے تقاضے ہیں اور ان کو ہم نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اوقات صبر وتحمل اور خاموشی کی روش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جارح اور ظالم دشمن کے جواب میں مسلح ہو کر میدان جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر ائمہ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اس نوع کی یکسانیت و یک رنگی ہے کہ انسان اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں کر سکتا۔

سوال: کیا اہل سنت بھائیوں کا نقطہ نظر جہاد کے بارے میں شیعوں سے مختلف ہے اگر ہے تو کیا ہے؟

جواب: مجھے اس سلسلے میں اہل سنت بھائیوں کی کتب کا مطالعہ کرنا پڑے گا اس کے بعد کچھ اس پر روشنی ڈال سکوں گا لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ یہ ہے کہ جہاد کے بارے میں شیعہ سنی کا کوئی اتنا بڑا فرق نہیں ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاد میں امام یا اس کے نائب سے اجازت لینا چاہیے ان کے نزدیک یہ شرط وقید نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں ہم سب مسلمان متحد ہیں کہ اگر کافر یا مشرک ملک یا شخص ہمارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے یا کسی کافر سے کسی مسلمان کی عزت و مال کو خطرہ ہے تو ہم سب پر واجب ہے کہ ہم اس کی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیں۔

صلح حضرت امام حسن علیہ السلام

ہماری بحث امام حسن ؑ کے بارے میں چل رہی تھی گزشتہ نشستوں میں
میں نے جنگ اور صلح پر اسلامی نقطہ نظر کو بیان کیا ہے اور میں نے وضاحت کے ساتھ
بیان کیا ہے کہ تاریخ اسلام سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ ہے امام وقت جو بھی قدم
اٹھاتا ہے وہ عدل وانصاف کے عین تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ ہمارے ائمہ
طاہرین ؑ نے اپنے ہر کام، ہر فعل اور ہر عمل میں جو بھی کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
ﷺ کی رضا کیلئے کیا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف مقامات پر صلح کی، مختلف
قراردادوں پر دستخط کیے، کبھی مشرکین کے ساتھ، تو کبھی اہل کتاب کے ساتھ کبھی آپ کو
جنگوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میں نے اپنی بات اور گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فقہی و
عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ دین ایک کامل ترین
مذہب اور نظریہ کا نام ہے ایسا نہیں ہے کہ اس کی ہم اپنی مرضی کے مطابق تاویل کرتے
رہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے حیات بخش اصول پہلے بھی موجود تھے اور
آج بھی ہیں اور قیامت تک اس کی حقانیت مسلم طور پر موجود رہے گی۔ اگر صلح کی بات
آتی ہے تو اس کی کچھ شرائط ہیں اسی طرح جنگ کے بارے میں اس کے معین کردہ
قوانین موجود ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر دشمن کو بات منانا
آسان ہوتا ہے اور اس میں جنگ وجدال کی نوبت نہیں آتی اور کبھی جو بات دشمن جنگ
کے ذریعہ مانتا ہے وہ صلح سے پوری نہیں ہوتی۔ میں نے گزشتہ محافل میں وضاحت کے
ساتھ گفتگو کی ہے اعتراضات کرنے والوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں
دراصل امام حسن ؑ کے دور امامت میں فضا اتنی مکدر تھی کہ صلح کے بغیر کوئی چارہ کار نہ

تھا، گویا آپ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن امام حسین ؑ کے دور میں زمین و
آسمان کا فرق تھا۔ اب میں اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد فیصلہ آپ کو
خود ہی کرنا ہے کہ امام حسن ؑ کو کیا کرنا چاہیے اور امام حسین ؑ کو کیا؟ اور ایک نے
صلح اور دوسرے نے جنگ کو کیوں چنا؟ آیئے چلتے ہیں تفصیل کی طرف:

امام حسن ؑ اور امام حسین ؑ کے ادوار میں فرق کتنا تھا؟ سب سے پہلا
فرق تو یہ ہے کہ امام حسن ؑ اس وقت مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو اس وقت
امیر شام مضبوط ترین پوزیشن بنا چکا تھا۔ حضرت علی ؑ نے زندگی میں کس طرح کی
صعوبتیں اور سختیاں برداشت کیں پھر آپ کو کس بیدردی اور مظلومیت کے ساتھ شہید
کر دیا گیا؟ اس عظیم اور مظلوم والد کی شہادت کے بعد امام حسن ؑ مسند خلافت پر
تشریف لائے، یہ حکومت اندرونی سطح پر بہت ہی کمزور ہو چکی تھی۔ تاریخ میں لکھا ہے
کہ امام ؑ کی شہادت کے اٹھارہ روز بعد امام حسن ؑ خلیفہ وقت مقرر ہوئے۔ ان
اٹھارہ دنوں کے اندر اندر امیر شام نے خود کو اچھا خاصا مضبوط و مستحکم کر لیا۔ اس نے
جگہ جگہ اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ پھر امیر شام عراق کو فتح کرنے کیلئے ایک کثیر تعداد کی
فوج اپنے ہمراہ لے کر عازم سفر ہوتا ہے، اور ادھر امام حسن ؑ بے پناہ مشکلات سے
دوچار تھے۔ ایک باغی اور سرکش شخص آپ کے خلاف بغاوت کر چکا تھا۔ اب یہاں پر
امام حسن ؑ کا قتل ہو جانا مسند خلافت کیلئے بہت زیادہ نقصان دہ تھا۔ ابتدائی ابتدائی
حالات تھے۔ اس کے برعکس امام حسین ؑ اس جگہ پر خاموش رہتے یا کسی خاص مصلحت
کا انتظار کرتے تو دین محمدی ﷺ نعوذ باللہ کب کا مٹ چکا ہوتا ادھر خاموشی عبادت،
ادھر جہاد کرنا عبادت، ایک مقام پر سکوت جہاد تھا اور دوسرے مقام پر جہاد ہی جہاد
تھا۔ امام حسن ؑ نے ایسے ایسے حالات میں ظلم وفساد کا مقابلہ کیا کہ اگر کوئی اور ہوتا تو
کب کا حکومت وقت کو تسلیم کر چکا ہوتا۔ امام حسن ؑ نے مصلحت کے تحت صلح کر لی

تھی، لیکن امیر شام کی حاکمیت، خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آپ نے کئی سالوں تک امیر شام کی شاطرانہ سیاست کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ آپ کو دھوکہ وفریب کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ آپ نے جرأت واستقامت کے ساتھ حالات کا انتہائی جرأتمندی اور پامردی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ امام حسن علیہ السلام کی حکومت عملی اتنی بلند تھی کہ امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی کی مدبرانہ سیاست کی تعریف کر کے اس سیاست کو آئیڈیل سیاست قرار دیا۔

اس لئے اعتراض کرنے والوں کو سمجھنا چاہیے کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے حالات میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ آپ مسند خلافت پر خلیفۃ المسلمین کے طور پر تشریف فرما تھے اگر ان کو وہیں پر قتل کیا جاتا تو یہ خلیفۃ المسلمین کا مسند خلافت پر قتل تھا جو کہ بہت بڑا مسئلہ تھا، امام حسین علیہ السلام نے بھی مسند خلافت پر شہید ہونے سے اجتناب کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام مکہ میں بھی شہید نہیں ہونا چاہتے تھے" کیونکہ اس سے مکہ کی بے حرمتی ہوتی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی السلام اس وقت غیر معمولی طور پر کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دور کے مخالفین کے مطالبات پورے کرتے ہوئے ان کے ساتھ صلح کریں۔ آپ ہر صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت وسلامتی کے خواہاں تھے، اور گاہے بہ گاہے ان کو مشورے بھی دیا کرتے تھے۔ نہج البلاغہ میں ہے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے ہیں۔ آپ کا ایک فرمان ہے:

"وخشیت ان اکون اثما"

"کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اس قدر دفاع کیا کہ اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں گناہگار نہ ہوجاؤں۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۴۰)

سوچنے کی بات ہے آپ خلیفہ صاحب کی حمایت کیوں کرتے تھے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ مسند رسول کی حفاظت کرنا تھی۔ آپ کی شبانہ روز کی کوشش کا مقصد عثمان رضی اللہ عنہ کو تحفظ فراہم کرنا تھا، کیونکہ یہ بات مسلمان کیلئے باعث ننگ وعار تھی کہ خلیفۃ المسلمین مسند خلافت پر قتل ہو اس سے مسند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حرمتی ہوگی۔

اس عظیم مقصد کی تکمیل کیلئے مولا علی علیہ السلام کو بے تحاشا قربانیاں دینا پڑیں۔ دوسری طرف آپ عوامی ردعمل کو بھی نہیں روکنا چاہتے تھے، کیونکہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ حاکم وقت سے اپنی بات کہے اور اس کے سامنے اپنے مطالبات دہرائے۔ آپ لوگوں کو بھی حکومت کے خلاف اجتماع کرنے سے روکنا نہیں چاہتے تھے، اور آپ کی یہ کوشش تھی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل نہ ہو، کیونکہ آپ مسند رسول کے تحفظ واحترام کو زندگی کا سب سے اولین مقصد سمجھتے تھے۔ بالآخر وہی ہوا کہ جس کا آپ کو ایک عرصہ سے خدشہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے۔ چنانچہ اگر امام حسن علیہ السلام انہی حالات میں امیر شام کے ساتھ مقابلہ کرتے تو ان کا حال بھی یہی ہوتا جیسا کہ تاریخ اسلام اس امر کی گواہ ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کو پتہ تھا کہ وہ شہید ہوجائیں گے۔ آپ تو صرف مسند خلافت کے احترام کی خاطر خاموش تھے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت علم جہاد بلند کرنے والے عظیم مجاہد کی شہادت تھی کہ جنہوں نے ایسے ظالم فاسق وفاجر شخص کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی کہ جو خود کو خلیفۃ المسلمین کہلواتا تھا۔ حالانکہ اس کا خلافت سے دور تک کا واسطہ نہ تھا، اس لئے تو میں نے کہا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے حالات وواقعات میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ ایک مقام پر چپ رہنا عبادت تھا اور دوسری جگہ پر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنا وقت کا اہم تقاضا تھا۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ کوفہ کی سرزمین اپنی بے وفائی کے باعث حق اور حق پرستوں کیلئے تنگ ہوچکی تھی۔ اگر امیر شام وہاں پر آجاتا تو بڑی آسانی سے اس کو فتح

کر لیتا، امام حسن علیہ السلام کے حامیوں کی اکثریت رخ موڑ چکی تھی، کوفہ منافقوں کا مرکز بن چکا تھا۔ کوفہ میں سب سے بڑا مسئلہ خوارج کا وجود میں آنا تھا۔ لوگ جاہلیت میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ حق کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس سوسائٹی کو نادانوں اور جاہلوں کی سوسائٹی سے تعبیر فرمایا نہج البلاغہ میں ہے کہ اس وقت کا معاشرہ تعلیم و تربیت سے عاری تھا۔ لوگ اسلام کو جانتے تک نہ تھے۔ اسلامی تعلیمات کو یکسر بھلا دیا گیا تھا۔ وہ لوگ مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن دراصل وہ اسلام کی الف ب سے بھی واقف نہ تھے۔

بہرحال کوفہ میں عجیب ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ امیر شام کوفہ میں اپنی بنیادیں مستحکم کر چکا تھا اس نے پیسہ خرچ کر کے کوفیوں کو خرید لیا تھا۔ جگہ جگہ پر جاسوس پھیلے ہوئے تھے۔ حکومتی مشینری نے امیر شام کے حق میں اور امام حسن علیہ السلام کے خلاف وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔ اگر اس وقت امام حسن علیہ السلام انقلاب برپا کرتے تو لوگوں کا ایک انبوہ امیر شام کے خلاف کھڑا ہو جاتا۔ شاید تیس چالیس آدمیوں کا لشکر آمادۂ پیکار ہوتا۔ تاریخ میں یہاں تک ملتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام ایک لاکھ تک افراد کو جمع کر سکتے تھے۔ آپ امیر شام کے ڈیڑھ لاکھ فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام نے آٹھ مہینوں تک امیر شام سے مقابلہ کیا۔ اس وقت عراقی فوجیں خاص کر مضبوط تھیں۔ آٹھ مہینوں کی مسلسل جنگ میں امیر شام مکمل طور پر جنگ ہار چکا تھا، چند غداروں نے مولا مشکل کشا کے خلاف سازش کر کے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کر کے میدان جنگ میں لے آئے۔

اگر امام حسن علیہ السلام جنگ کرتے تو شام و عراق کی دو مسلمان فوجوں کے مابین جنگ طول پکڑ جاتی اور ہزاروں قیمتی جانوں کا ضیاع ہوتا، اس سے حاصل کیا ہوتا؟ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے وہ یہ ہے کہ امیر شام اپنی تمام تر چالاکیوں کی وجہ سے

کامیاب ہو جاتا، اب آپ ہی اندازہ کریں کہ امام حسن علیہ السلام دو سالوں تک جنگ کرتے اور ہزاروں افراد قتل ہوتے اور نتیجہ مسند خلافت پر امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر منتج ہوتا۔ امام حسن علیہ السلام کے پاس بہتر (۷۲) اشخاص موجود تھے۔ آپ نے ان کو بھی واپس بھیج دیا اور فرمایا تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ میں جانوں اور دشمن کی فوج جانے اور اگر میں اس حال میں شہید ہو جاؤں تو اس سے بہتر میرے لئے کیا اعزاز ہوگا۔

چنانچہ یہ وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے امام حسن علیہ السلام کو صلح کرنا پڑی۔ ایک یہ کہ آپ نہ چاہتے تھے کہ دشمن آپ کو مسند رسول پر قتل کر کے اس عظیم مسند کی توہین کرے۔ دوسرا آپ یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کا قتل عام ہو۔ آپ اس وقت امیر شام کی فوج کے ساتھ بھرپور مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن آپ نے امن و عامہ کی بحالی و برقراری اور مسند رسول کے تحفظ و احترام کی خاطر ہتھیار اٹھانے اور حملہ کرنے کے بجائے صلح و آشتی کو ترجیح دی۔ آپ نے اپنے قول و فعل کردار و گفتار کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ خاندان رسالت اسلامی و انسانی اقتدار کی کس طرح پاسداری کرتا ہے۔

صلح حضرت امام حسن علیہ السلام اور قیام حضرت امام حسین علیہ السلام کے محرکات

حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات میں بہت زیادہ فرق تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے عظیم انقلاب اور بے نظیر جہاد کے تین محرکات ہمارے سامنے آتے ہیں میں ان تینوں عوامل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں، جبکہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دور میں صورت حال کچھ اور طرح کی تھی۔

حسینی علیہ السلام انقلاب کا پہلا محرک یہ تھا ظالم حکومت نے امام حسین علیہ السلام سے بیعت کرنے کا مطالبہ کیا کہ:

"خذ الحسين بالبيعة اخذا شديدا ليس فيه رخصة"

کہ امام حسین علیہ السلام کو بیعت کیلئے گرفتار کر لے اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے یہاں تک کہ وہ بیعت کیے بغیر کہیں نہ جا سکیں۔"

وقت کے فاسق وفاجر شخص نے وقت کے سب سے بڑے امام اور معصوم ہستی سے بیعت کا تقاضا کیا جو کہ ناممکن تھا۔ امام عالی مقام نے جو جواب دیا وہ یہ تھا میں اور یزید کی بیعت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ حق اور باطل کی پیروی یہ ناممکن بات ہے۔ کہاں وہ بدترین شخص اور کہاں میں پروردہ عصمت! بھلا رات اور دن بھی ایک جگہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت مشکل بات ہے۔ لیکن امام حسن علیہ السلام سے امیر شام نے صلح کی پیشکش تو کی تھی۔ بیعت کا تقاضا نہ کیا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ آپ میری خلافت کو تسلیم کر لیں۔ یہ بات تاریخ کی کسی کتاب میں نہیں ہے کہ امیر شام نے امام علیہ السلام سے بیعت

کرنے کا کہا ہو، یا امام علیہ السلام کے کسی صحابی یا کسی ماننے والے سے بیعت کا تقاضا کیا ہو۔ دراصل ان کے درمیان بیعت کی بات بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسئلہ بیعت نے امام حسین علیہ السلام کو قیام کرنے اور علم جہاد بلند کرنے پر مجبور کیا۔ اور یہ مجبوری امام حسن علیہ السلام کو درپیش نہ تھی اگر اس طرح کا مسئلہ ہوتا تو امام حسن علیہ السلام اسی طرح کرتے جس طرح ان کے عزیز ترین بھائی امام حسین علیہ السلام نے کیا تھا۔

قیام حسینی علیہ السلام کی دوسری وجہ! دعوت کوفہ تھی، وہاں کے لوگوں نے بیس سال تک امیر شام کے مظالم برداشت کیے اور وہ بہت تھک چکے تھے۔ ان کو امام عادل کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کوفہ کی فضا کا رنگ یکسر بدل چکا تھا۔ ایک بہت بڑے انقلاب کی پیشین گوئی کی جا رہی تھی۔ کوفہ والوں نے امام حسین علیہ السلام کی طرف بیس ہزار خطوط ارسال کیے ان سب میں ان لوگوں کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ مولا آپ سرزمین کوفہ پر قدم رکھ کر ہماری آنکھوں کو ٹھنڈا کیجئے۔ اب ہم سے آپ کا مزید انتظار نہیں کیا جاتا۔ لیکن امام حسین علیہ السلام جب تشریف لائے تو کوفہ والے بالکل انجان بن چکے تھے۔ تاریخ نقطہ نظر سے اگر امام عالی مقام اہالیان کوفہ کے خطوط کو اہمیت نہ دیتے تو تاریخ میں آپ پر اعتراض کیا جا سکتا تھا۔ دنیا والے کہہ سکتے تھے کہ کوفہ کی سرزمین انقلاب کیلئے بالکل تیار تھی لیکن امام حسین علیہ السلام تشریف نہ لائے۔ لیکن امام حسن علیہ السلام کو اس طرح کا مسئلہ درپیش نہ تھا۔ اس وقت کا کوفہ اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ لوگوں کی سوچیں بکھری اور اذہان پریشان تھے۔ ایسا کوفہ کہ جو اختلافات کا مرکز بن چکا تھا۔ وہ کوفہ کہ جس کی حضرت علی علیہ السلام نے آخر وقت میں مذمت کی تھی۔ آپ نے خدا سے دعا کی تھی کہ بار الہا! مجھے ان لوگوں کے درمیان سے اٹھا لیجئے اور ان پر ایسا حکمران مسلط فرما کہ جس کے یہ اہل ہیں۔ تا کہ ان کو میری حکومت کی قدر معلوم ہو سکے۔

میں جو عرض کرنے لگا ہوں وہ یہ ہے کہ کوفہ تیار ہے۔ یہ امام حسین علیہ السلام سے اتمام حجت کے طور پر کہا گیا تھا، حالانکہ حقیقت میں وہ کسی صورت میں بھی انقلاب کیلئے سازگار نہ تھا۔ اب اگر امام عالی مقام لوگوں کے اس مطالبہ پر خاموش رہتے تو کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ امام علیہ السلام نے مسلمانوں کی (نعوذ باللہ) پروانہیں کی، لیکن امام حسن علیہ السلام کا معاملہ اور تھا۔ آپ کے دور میں کوفہ کے لوگوں نے اپنی بے وفائی دکھادی تھی اور انہوں نے یہ بات واضح کردی تھی کہ وہ امام علیہ السلام کا ساتھ دینے کیلئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ کوفہ کی فضا اس قدر بدلی ہوئی تھی اور کوفی اس قدر بے وفا تھے کہ امام حسن علیہ السلام کوفیوں سے ملنا جلنا قطعی طور پر پسند نہ کرتے تھے۔ آپ گھر سے آتے جاتے وقت بہت زیادہ محتاط ہوتے یہاں تک کہ آپ اپنے لباس کے اندر زرہ پہن کر آتے تھے تاکہ خدانخواستہ اگر کوئی شرپسند حملہ کرے تو آپ اپنا تحفظ کرسکیں۔ دوسری طرف آپ کو خوارج اور امیر شام سے سخت جانی خطرہ تھا۔ ایک مرتبہ آپ نماز پڑھنے میں مشغول تھے تو اچانک آپ پر کسی نے تیر پھینکنے شروع کردئے چونکہ آپ نے لباس کے نیچے زرہ پہن رکھی تھی اس لئے اس ظالم کا حملہ کارآمد نہ ہوا۔ اور آپ بچ گئے چونکہ کوفہ والوں نے امام حسین علیہ السلام کو کوفہ میں آنے کی دعوت دی تھی اس لئے آپ کی شرعی ذمہ داری تھی کہ احسن طریقے سے ان کے خطوط کا جواب دیں۔ اور امام حسن علیہ السلام کے دور امامت میں کوفہ کی سرزمین نفاق اگل رہی تھی چاروں طرف بغض وعناد کی چنگاریاں نکل رہی تھیں حالات یہ تھے کہ بکھرتے چلے جارہے تھے اس لئے آپ نے خاموشی اختیار کی۔

امام حسین علیہ السلام کے قیام کا تیسرا محرک

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہم ذمہ داری نبھانا تھی۔ قطع نظر اس کے کہ حکومت وقت نے امام حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کی، اور قطع نظر اس کے کہ امام حسین علیہ السلام کو کوفہ میں آنے اور ان کی ہدایت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اتمام حجت کے طور پر ان کو کوفیوں کے خطوط کا مثبت جواب دینا تھا دوسرے لفظوں میں اگر امام حسین علیہ السلام سے وہ بیعت طلب نہ کرتے تب بھی آپ کو قیام کرنا تھا اگر کوفہ آنے کی دعوت نہ دیتے تب بھی آپ کو یزیدی حکومت کے خلاف قیام کرنا تھا۔ یہ تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اگرچہ امیر شام نے بیس سال تک حکومت کی اور اس نے اسلامی تعلیمات کے خلاف بے شمار اقدامات کیے وہ واقعتاً ایک ظالم حکمران تھا اس کی بدعنوانیاں اور زیادتیاں سب پر عیاں تھیں اس نے احکام شریعت میں کمی بیشی کی تھی بیت المال کو ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کیا، محترم اور قابل قدر انسانوں کا خون بھی بہایا۔ غرضیکہ وہ سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اس کے جو جی میں آیا کیا ان تمام گناہوں کے باوجود اس نے ایک ایسا بڑا جرم اور گناہ کبیرہ سے بڑھ کر گناہ کیا وہ یہ کہ اس نے اپنے ظالم، بے دین، فاسق وفاجر شرابی بیٹے کو مسند خلافت پر بٹھادیا۔ ہم پر شرعی فرض عائد ہوتا ہے کہ اس پر اعتراضات کریں، اس سے پوچھیں کہ اس نے ایسے نااہل شخص کو عظیم منصب پر کیوں بٹھایا؟ حالانکہ امام حسین علیہ السلام جیسی جلیل القدر موجود شخصیت تھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"من رای سلطانا جائزا مستحلا لحرام الله ناکثا عهده،
مخالفا لسنة رسول الله یعمل فی عبادا لله بالاثم

والعدوان" فلم یغیر علیه بفعل ولاقول، کان حقا علی الله ان یدخله مدخله الا وان هولاء قدلزموا اطاعة الشیطان"

"اگر کوئی شخص ایک ایسے ظالم حکمران کو دیکھے جو حلال خدا کو حرام کر دے اور اس سے کیے گئے وعدے کو توڑ دے سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف عمل کرے، لوگوں میں گناہ کا مرتکب ہو تو لوگ اس کو قول و فعل کے ذریعہ منع نہ کریں تو خداوند کریم اس کو ضرور ہی ایسا عذاب دے گا جس کا وہ حکمران مستحق ہوگا"۔

امیر شام کے دور حکومت میں ایسا ہی تھا۔ امام حسن علیہ السلام اس کے کاموں پر راضی نہ تھے اور اس کو مظالم اور گناہوں سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتے تھے۔

امیر شام حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں یہ ڈھنڈورا پیٹتا رہا کہ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہوں لیکن اب وہ کہتا تھا کہ میں قرآن وسنت اور سیرت خلفاء پر سوفی صد عمل کروں گا۔ اپنا جانشین بھی مقرر نہیں کرتا۔ میری خلافت کے بعد یہ خلافت حضرت حسن بن علی علیہ السلام کو منتقل ہو جائے گی۔ گویا اس نے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا خلافت امام حسن علیہ السلام کی ہے اور آپ ہی اس کے سزاوار ہیں۔ فی الحال آپ یہ ذمہ داری مجھے سونپ دیں میں ان شرائط کے تحت عمل کروں گا۔ اس نے ایک سفید کاغذ امام علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کیا اور اس پر اپنے دستخط بھی کر دیئے اور کہا کہ امام حسن علیہ السلام جو بھی مناسب سمجھیں اپنی شرائط لکھ دیں، میں ان کو قبول کرتا ہوں۔ میں صرف حاکم وقت کے طور پر کام کرنا چاہتا ہوں اور میری کوشش ہوگی کہ اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کروں۔ دراصل یہ ایک طرح کی امیر شام کی شاطرانہ چال تھی۔ اب اگر فرض کریں کہ ایسا ایک عظیم امام علیہ السلام کے ساتھ کیوں ہوا ہے کہ امیر شام

نے سفید کاغذ بھیج کر امام علیہ السلام سے دستخط لئے اور کچھ شرائط پیش کر کے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ آپ ایک کنارے پہ چلے جائیں۔ آپ کو خلافت کی ضرورت ہی نہیں ہے آپ کی جگہ پر میں جو ہوں۔ رہی بات اسلامی قوانین کے نفاذ کی تو میں کر لوں گا۔ اب اگر آپ ہماری شرائط قبول نہیں کریں گے تو ایک خونی جنگ شروع ہو جائے گی۔

لہذا آپ چھوڑیں سب باتوں کو اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔

اگر امام حسن علیہ السلام اس مقام پر صبر و تحمل سے کام نہ لیتے تو ایک بہت بڑی جنگ چھڑ سکتی تھی یہ جنگ دو تین سالوں تک لڑی جاتی اور اس میں ہزاروں افراد لقمہ اجل ہوتے جانی و مالی نقصان کے ساتھ ساتھ امام حسن علیہ السلام بھی شہید ہو جاتے تو آج تاریخ اسلام امام حسن علیہ السلام پر اعتراض کر سکتی تھی کہ آپ نے جنگ کی بجائے امن کو ترجیح کیوں نہیں دی؟ امام علیہ السلام نے اس میں صلح کو ترجیح دی۔ پیغمبر اسلام نے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کئی موقعوں پر صلح کی تھی انسان کو بھی صلح کرنی چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ امیر شام صرف حکومت چاہتا تھا نہ وہ آپ سے یہ خواہش کرتا تھا کہ آپ علیہ السلام اس کو بطور خلیفہ تسلیم کریں اور وہ یہ نہ کہتا تھا کہ آپ اسے امیر المومنین علیہ السلام کا لقب دے کر پکاریں۔ وہ آپ سے بیعت کا مطالبہ کرتا ہے اگر آپ کہیں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے تو وہ آپ کے بابا علی علیہ السلام کے شیعوں کو امن و امان کے بارے میں لکھ کر دینے کو تیار ہے صفین کی تمام ناراضگیاں ختم کرتا ہوں۔ آپ کی مالی پریشانی دور کرتا ہوں، حسب ضرورت رقم بھی دیتا ہوں تا کہ آپ کسی قسم کی اقتصادی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔ آپ اور آپ کے شیعہ آرام سے زندگی بسر کریں۔

اگر امام حسن علیہ السلام ان شرائط کے ساتھ صلح نہ کرتے تو آج بھی تاریخ ان پر یہ اعتراضات کر سکتی تھی جب آپ نے امیر شام کی شرائط کو مان لیا تو تاریخ آج اس کی مذمت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہ امیر شام ایک چالاک و عیار سیاستدان تھا وہ ان

شرائط کی آڑ میں دنیاوی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ حکومتی، سیاسی مفادات کے تحفظ کے سوا اور کچھ نہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مکمل طور پر مسند حکومت پر براجمان ہوگیا تو وہ نہ فقط ان طے کردہ شرائط کو بھول گیا بلکہ وہ امام علیہ السلام کو طرح طرح کی اذیتیں دینے لگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ کوفہ میں آتا ہے تو لوگوں میں تقریر کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے اے کوفہ والو! میں نے پہلے آپ سے جنگ اس لئے نہیں کی کہ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں" **ولکن لا تامرکم علیکم** " بلکہ اس لئے جنگ کی کہ آپ پر حکومت کروں۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ میں نے کیا کہا تو پھر پینترا بدل لیا اور کہا اس قسم کے مسائل آپ خود حل کریں میں ان مسائل کے بارے میں کیا کیا کرتا پھروں۔ پہلے تو اس نے خود ہی یہ شرط لگا دی کہ میرے مرنے کے بعد خلافت امام حسن علیہ السلام کو ملے گی اور ان کے بعد امام حسین علیہ السلام کو لیکن سات آٹھ سالوں کے بعد جب اس نے دیکھا کہ اس کی حکومت ختم ہونے والی ہے تو اس نے یزید کی خلافت کا مسئلہ شروع کر دیا چونکہ حضرت علی علیہ السلام کے ماننے والے اس کی قرارداد کو جانتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے اس پروگرام کی مخالفت کی۔

تو اس نے مومنین کے ساتھ وہی کیا جو کہ ایک ظالم حکمران اپنی رعیت کے ساتھ کرتا ہے۔ واقعتاً امیر شام شروع ہی سے شاطر وعیار شخص تھا۔ فقہاء اسلام نے اس کو خلفاء کی فہرست سے اس لئے خارج کر دیا کہ اس کے سیاہ اعمالناموں کو دیکھ کر تاریخ اسلام شرما اٹھتی ہے۔ وہ ان حکمرانوں سے بھی پست سوچ رکھتا تھا جو عام دنیا کی خاطر صرف اور صرف حکومت کرنے آتے ہیں۔ اس طرح کے بادشاہ اپنی حفاظت کرتے ہے اور اپنی ہی حکومت کی بقاء چاہتے ہے ان درباروں میں فقط خوشامدیوں کو نوازا جاتا ہے۔ امیر شام کی تاریخ کو پڑھا جائے تو اس کو کسی طرح کوئی بھی مسلمانوں کا خلیفہ کہنا

پسند نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے جب امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے حالات کا موازنہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان دونوں شہزادوں، آقا زادوں کے حالات کا آپس میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر حالات بدلے، زمانہ بدلا، منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وہ شخص براجمان ہوا جو اسلام تو اسلام انسانیت کا دشمن تھا۔ اس وقت امام حسین علیہ السلام نے جو موقف اختیار کیا قیامت تک آنے والے حق پرست اس جملے کو سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"من رای سلطانا جائزا مستحلا لحرام اللہ کان حق علی اللہ
ان یدخلہ مدخلہ"

کہ اگر کوئی ظالم شخص کی حکومت کو دیکھے کہ وہ ایسے ایسے کام کر رہا ہو اور ان کو دیکھ کر وہ چپ رہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ گناہگار ہے۔"

اس وقت امام حسن علیہ السلام نے اسلام کی عظیم تر مصلحتوں اور حکمتوں کے مطابق عمل کرتے ہوئے مکر وفریب کے مقابلے میں امن وشرافت کی وہ داغ بیل ڈالی کہ انسانیت قیامت تک اس پر فخر کرتی رہے گی۔ دراصل امام حسن علیہ السلام کی صلح قیام حسینی علیہ السلام کے لئے پیش خیمہ تھی۔ ضروری تھا کہ امام حسن علیہ السلام ایک عرصہ تک کے لئے خاموش ہوجائیں تاکہ اموی خاندان کی اصلیت اور حقیقت لوگوں پر آشکار ہوجائے اور اس کے بعد ایسا عالمگیر انقلاب آئے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ انسانی کے ماتھے کا جھومر بن جائے۔ امیر شام نے جب قرارداد کے اصولوں کی کھلے عام خلاف ورزی کی تو امام حسن علیہ السلام کے کچھ شیعہ آپ کی خدمت میں آئے اور عرض کی یا حضرت علیہ السلام! اب وہ قرارداد خود بخود ختم ہوگئی ہے کیونکہ امیر شام نے اس کو خود ہی منسوخ کر دیا ہے اور اس کے اصولوں کو پامال کر دیا ہے لہذا آپ اٹھیے، قیام فرمایئے، فرمایا یہ انقلاب امیر شام

کے بعد ہی آئے گا یعنی آپ لوگ صبر کریں۔ ایک مناسب وقت کا انتظار کریں، یہاں تک صورت حال واضح ہوجائے۔ وہی وقت وقت قیام ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام امیر شام کے بعد تک زندہ رہ جاتے تو آپ وہی کرتے جو کہ امام حسین علیہ السلام نے کیا تھا۔ آپ ہر صورت میں علانیہ طور پر علم جہاد بلند کرتے۔ متذکرہ بالا قیام حسینی کے تین محرکات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ امام حسن علیہ السلام کا زمانہ امام حسین علیہ السلام کے دور سے یکسر مختلف تھا۔ ایک جگہ پر خاموشی مصلحت تھی، سکوت عبادت تھا اور دوسری جگہ پر کلمہ حق بلند کرنا، یزیدیت کے خلاف آواز بلند کرنا عبادت تھی۔ ایک امام سے بیعت طلب نہیں کی گئی اور دوسرے سے کی گئی دراصل بیعت کرنا بذات خود بہت بڑا مسئلہ ہے۔

میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ اگر امام حسین علیہ السلام کوفہ والوں کی درخواست مسترد کردیتے تو دامن عصمت پر اعتراض ہوسکتا تھا۔ لیکن امام عالی مقام کے انقلاب آفرین کردار نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ بیس سال کے بعد کوفہ پھر اور کوفہ تھا۔ اس کوفے والے بنی امیہ سے سخت نفرت کرنے لگے، امام علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام سے اظہار عقیدت ہونے لگا، آج کے لوگ امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت پر آنسو بہا رہے تھے۔ درختوں نے پھل دینے شروع کیے ہیں۔ زمینیں سرسبز شاداب ہو چکی ہیں۔ مولا تشریف لے آیئے۔ یہاں کی فضا ساز گار ہے۔ اسی طرح کی دعوت اس بات کی مقتضی تھی کہ آپ کوفہ جائیں۔ جبکہ امام حسن علیہ السلام کے زمانے کا کوفہ کچھ اور طرح کا کوفہ تھا۔ امام حسن علیہ السلام کے خاموش اور پرحکمت انقلاب نے ایک نئی تاریخ مرتب کی اور ایک عالمگیر انقلاب کی کامیابی کا راستہ ہموار کیا۔ تیسرا محرک حکومت کی بدعملی تھی امام حسن علیہ السلام کے دور میں امیر شام اتنا کھل کر فسق و فجور نہ کرتا تھا کہ جتنا یزید نے کیا۔ امام حسن علیہ السلام نے ایک وقت کا انتظار کیا۔ اور اسی وقت کی ذمہ داری آپ کے پیارے

بھائی نے اپنے ہاتھوں پر لی۔ اسلام کے مرجھائے ہوئے درخت اور کملائے ہوئے پھولوں میں وہ جان ڈالی کہ وہ درخت قیامت تک کے اجڑے ہوئے انسانوں اور لٹے ہوئے قافلوں کو غیرت وحیریت کے ساتھ جینے کا حوصلہ دیتا رہے گا۔

قرارداد میں کیا تھا؟

اب میں آپ کے سامنے وہ قرارداد کی عبارت پیش کرتا ہوں جو کہ امیر شام نے امام حسن علیہ السلام کے ساتھ باندھی تھی:

۱) امیر شام کی حکومت واگزار کی جارہی ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن وسنت اور سیرت خلفاء پر عمل کرے گا۔ میں یہاں پر ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اصول تھا کہ خلافت میرے ہاتھ میں ہو یا کسی اور کے ہاتھ میں باوجودیکہ خلافت میرا حق ہے میں قیام نہیں کروں گا، یہ لوگوں کا کام ہے، میں اس وقت قیام کروں گا جب خلافت غصب کی جارہی ہوگی نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"والله لا سلمن ما سلمت امور المسلمين ولم يكن فيها جور الاعلى خاصة"

امام حسن علیہ السلام کی قرارداد بھی یہی تھی کہ جب تک فقط مجھ پر ظلم کیا جارہا ہو، اور میرا حق غصب کیا گیا ہو تب تک میں خاموش رہوں گا لیکن جب کوئی غاصب حکمران مسلمانوں کے شرعی امور میں داخل اندازی کرنے لگ جائے تو پھر خاموشی اختیار نہیں کی جاسکتی۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۴۰۔)

۲۔ امیر شام کے مرنے کے بعد حکومت کرنے کا حق امام حسن علیہ السلام کو ہوگا

اوران کے بعد امام حسین علیہ السلام مسند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہوں گے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صلح عارضی مدت کے لئے تھی۔ امام حسن علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اب ہم جارہے ہیں تو جانے اور یہ خلافت جانے جب تک جی چاہے حکومت کرتا رہے پھر یہ صلح امیر شام کی زندگی تک تھی اس کے بعد وہ صلح خود بخود ختم ہوجائے گی اس لئے امیر شام کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ سازشوں کے جال بچھاتا پھرے اور نہ ہی وہ کوئی دوسرا شخص بطور خلیفہ معین کرسکتا ہے۔

۳۔ امیر معاویہ شام میں حضرت علی علیہ السلام پر کھلے عام طعن وتشنیع کرتا تھا اس صلح نامہ میں شرط عائد کی گئی کہ اس عمل بد کو روکا جائے۔

امیر شام نے نمازوں کے وقت جو علی علیہ السلام پر طعن وتشنیع کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس دن سے موقوف ہوگیا اب وہ علی علیہ السلام کو اچھے لفظوں کے ساتھ یاد کرتا تھا۔ اس قرارداد پر امیر شام نے دستخط کیے اور یہ سلسلہ رک گیا اس سے بیشتر وہ علی علیہ السلام کے خلاف جگہ جگہ پروپیگنڈا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ہم ان کو برا بھلا (نعوذ باللہ) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اسلام سے خارج ہوچکے تھے۔ اب امیر شام پر اعتراض ہونے لگا کہ تو ایک شخص کو لعنت کا حقدار سمجھتا تھا اب تو اس کو اچھے لفظوں کے ساتھ یاد کررہا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ خواہشات نفسانی کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اس نے قرارداد کے اصولوں کو توڑ دیا، انسانی اقدار کو روند ڈالا اور پھر نوے (۹۰) سال تک یہ سلسلہ طول پکڑ گیا۔

۴۔ کوفہ کے بیت المال میں پانچ ملین درہم موجود تھے لہٰذا قرارداد کے مطابق اس کو سال میں دو ملین درہم امام حسن علیہ السلام کو بھیجنے چاہیں تھے یہ بات باقاعدہ قرارداد میں درج تھی تاکہ امام علیہ السلام اپنی اور اپنے ماننے والوں کی ضرورت پوری کرسکیں۔ ہدایا اور عطیات کے سلسلے میں بنی ہاشم کو بنی امیہ پر اہمیت دی جائے اور

ایک ملین درہم امیر المومنین علیہ السلام سے تعلق رکھنے والے شہداء کے وارثان میں تقسیم کیا جائے۔ وہ شہدا جو جنگ جمل وصفین میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے تھے۔ شیراز کے آس پاس جتنا بھی علاقہ تھا وہ بنی ہاشم کے ساتھ خاص کردیا گیا اور اس کی تمام آمدنی ان کو دی جائے گی۔

۵۔ لوگوں کے لئے امن وحفاظت کو یقینی بنایا جائے۔ شام، عراق، یمن، حجاز، اور دیگر شہروں کے لوگوں کی حفاظت کی جائے کالے گورے کی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اور امیر شام کو چاہیے کہ جنگ صفین کی تمام باتیں بھلا دے۔ وہ لوگ جو صفین میں امیر شام کے خلاف لڑے تھے۔ امیر شام ان کی حفاظت وسلامتی کیلئے ضروری اقدامات کرے۔ عراقی عوام بھی پرانی سب باتیں بھلا دیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب جہاں کہیں بھی آباد ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے، اور شیعیان علی علیہ السلام کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ علی علیہ السلام کے چاہنے والے اپنے مال، جان، ناموس اور اولاد کے سلسلے میں بے خوف رہیں۔ ان کی ہر لحاظ سے حفاظت کی جائے۔ حقدار کو حق دیا جائے اور اصحاب علی علیہ السلام کے پاس جو کچھ ہے ان سے نہ لیا جائے۔ اور امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام اور خاندان رسالت کے کسی فرد کو تکلیف نہ پہنچے۔ ان کا احترام کیا جائے آرٹیکل نمبر ۵ اور ۳ میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف کھلے عام مخالفت کرنے کے بارے میں تھا۔ اگرچہ امیر شام نے پہلی شرط میں بھی مان لیا تھا کہ وہ قرآن وسنت اور سیرت خلفاء کے مطابق عمل کرے گا لیکن پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اس مسئلہ کو علیحدہ شرط کے طور پر لکھ رہا تھا؟ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا والوں پر ثابت کردے کہ مولا علی علیہ السلام کے خلاف ناسزا الفاظ کہنا جائز ہے؟ یہ بھی ایک طرح کی سازش تھی۔ یہ تھی قرارداد کی مجموعی عبارت! امیر شام نے اپنے نمائندہ خصوصی عبداللہ بن عامر کو خالی کاغذ پر اپنے دستخط کرکے امام حسن علیہ السلام کے پاس بھیجا آپ جو بھی شرائط لکھیں گے میں ان کو

قبول کروں گا اس کے بعد امیر شام نے خدا اور پیغمبر کی قسمیں کھائیں کہ وہ ایسا کرے گا اور ایسا نہ کرے گا اور اس نے زبانی طور پر اس طرح کی باتیں کیں اور پھر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ یہ بات بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گی کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے زمانوں اور حالات میں بہت زیادہ فرق تھا۔

اگر امام حسین علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے تو آپ بھی وہی کرتے جو کہ آپ کے بڑے بھائی جناب امام حسن علیہ السلام نے کیا تھا اسی طرح امام حسن علیہ السلام امیر شام کے بعد تک زندہ رہتے تو آپ امام حسین علیہ السلام کی مانند قیام کرتے ان دونوں شہزادوں کا طرز زندگی اور حکمت عملی ایک جیسی تھی کیونکہ وہ ایک شجر کے دو ثمر تھے۔

سوال اور جواب سوال:

اگر حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے تو کیا آپ صلح کرتے یا نہ؟ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ میں امیر شام کی حکومت کو ایک دن کیلئے برداشت نہ کروں گا لیکن امام حسن علیہ السلام نے حکومت امیر شام کو کیوں تسلیم کیا؟

جواب: آپ کے اس سوال کا جواب صاف ظاہر ہے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام اپنے صاحبزادے، امام حسن علیہ السلام کی جگہ پر ہوتے تو بالکل ویسا کرتے جس طرح امام حسن علیہ السلام نے کیا تھا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام کو مسند خلافت پر قتل کیے جانے کا خدشہ ہوتا یا ویسے حالات پیدا ہوتے جو کہ امام حسن علیہ السلام کو پیش آئے تھے تو آپ بھی انہی شرائط کے تحت صلح کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے لیکن حضرت علی علیہ السلام کا دور بہت مختلف دور تھا۔ مولا علی علیہ السلام کو طرح طرح کی الجھنوں اور مشکلات میں الجھایا گیا۔ فتنوں، شرانگیزیوں، سازشوں، شورشوں اور یورشوں نے مولا علی علیہ السلام کو یوں الجھائے رکھا کہ اگر آپ کی جگہ پر پتھر ہوتا تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا، اگر لوہا ہوتا تو وہ بھی موم ہو جاتا۔ یہ صرف اور

صرف علی علیہ السلام کا دل تھا کہ مصیبتوں کے طوفانوں اور پہاڑوں کا شجاعانہ مقابلہ کرتے رہے۔ جنگ صفین میں آپ فتح حاصل کر چکے تھے۔ اگر خوارج نیزوں پر قرآن بلند کر کے نہ آتے تو علی علیہ السلام بڑی آسانی سے جنگ جیت چکے ہوتے۔ باقی آپ کا یہ کہنا کہ مولا علی علیہ السلام مشکل کشاء، شیر خدا ایک دن بھی امیر شام کی حکومت کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، لیکن امام حسن علیہ السلام نے حکومت کو تسلیم کر لیا تھا؟

آپ نے ان دونوں مسئلوں کو خلط ملط کر دیا، حالانکہ یہ دونوں مسئلے الگ الگ ہیں۔ ان کے درمیان ویسے ہی فرق ہے جیسا کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے احوال میں فرق تھا۔ جس طرح حضرت علی علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ امیر شام آپ کا نائب بن کر مسند خلافت پر بیٹھے یا آپ علیہ السلام اس کو حاکم وقت مقرر کریں، اسی طرح امام حسن علیہ السلام نے بھی اس کو اپنا نائب اور جانشین نہیں بنایا تھا۔ صلح کا مقصد یہ ہے کہ آپ ایک کنارے پر چلے گئے تھے۔ آپ نے اس کی حکومت کو قطعی طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس قرارداد میں آپ کو ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملے گا کہ جس میں آپ نے امیر شام کو بطور خلیفہ تسلیم کیا ہو۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ایک کونے میں جا رہے ہیں اور تو جانے اور تیرا کام جانے۔ آپ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ تو جو کچھ کام انجام دے گا وہ ٹھیک ہے۔ پس حالات کا فرق ہوا تو طریقہ کار بھی بدل گیا۔ جس طرح مولا علی علیہ السلام نے حکومت کو مسترد کر دیا تھا اسی طرح امام حسن علیہ السلام نے بھی اس کی حقانیت و خلافت کو قبول نہیں کیا تھا۔ موقع محل کو دیکھ کر جس طرح تلوار اٹھانا عبادت ہے اسی طرح امت اسلامیہ کی بہتری کیلئے خاموش ہو جانا بھی عبادت ہے۔

سوال: کیا حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام کو یہ وصیت کی تھی کہ آپ اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کریں؟

جواب: مجھے یاد نہیں آ رہا کہ امام علیہ السلام نے اس قسم کی کوئی وصیت کی ہو لیکن

جہاں تک تاریخ میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام آخر دم تک امیر شام سے جنگ کرنے کے خواہاں تھے۔ آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس چپقلش سے دوچار تھے۔ امام علی علیہ السلام کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ امیر شام کی منافقانہ ڈپلومیسی تھی۔ حضرت اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ جب تک امیر شام ہلاک نہیں ہوجاتا اس سے جنگ جاری رکھنی چاہیے۔ آپ کی شہادت سے امیر شام سے جنگ کا سلسلہ ٹوٹ گیا اگر آپ کو شہید نہ کیا جاتا تو ایک اور جنگ پیش آسکتی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام کا نہج البلاغہ میں ایک مشہور خطبہ ہے اس میں آپ لوگوں کو جہاد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد جنگ صفین میں شہید ہونے والے اپنے باوفا صحابہ کو یاد کرتے ہیں۔ فرمایا:

"این اخوانی الذین رکبوا الطریق ومضوا علی الحق این عمار واین ابن التیھان واین ذو الشھادتین"

"کہاں گئے ہیں میرے بھائی، میرے ساتھی، وہ سیدھے راستے پر سوار ہوئے یقیناً وہ حق پر تھے عمار یاسر اور میرے دوست کہاں ہیں؟" (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۲)

اس کے بعد آپ نے گریہ کیا۔ آپ کا یہ خطاب نماز جمعہ میں تھا۔ آپ نے لوگوں کو آگے بڑھنے اور جہاد کرنے کی ترغیب دلائی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ابھی دوسرا جمعہ نہ آیا تھا کہ آپ کو ضربت لگی اور شہید ہوگئے۔ امام حسن علیہ السلام نے بھی شروع میں امیر شام سے جنگ کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن جب اپنے اصحاب کی بے پرواہی اور اندرونی اختلافات کو ملاحظہ فرمایا تو آپ نے جنگ کا ارادہ ترک کردیا۔ دوسرے

لفظوں میں جب آپ نے یہ دیکھا کہ جنگ کرنے سے جگ ہنسائی ہوگی آپ نے بہتر سمجھا کہ اس حالت میں خاموش رہنے ہی میں عافیت ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے ایمانی لحاظ سے ایک طاقتور جماعت تیار کی جو کہ بڑی اور سخت سے سخت مشکل کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ یہ کسی تاریخ نے نہیں لکھا کہ آپ کی جماعت کا کوئی ایک فرد بھی دشمن کی فوج میں شامل ہوا ہو بلکہ آخری دم تک استقامت کے یہ پہاڑ اپنی اپنی جگہوں اور اپنے ارادوں پر ڈٹے رہے۔ ان کے بچوں تک نے بھی خواہش نہیں کی وہ فوج یزید میں سے ہوتے؟ لیکن امام علیہ السلام کی پاکیزہ کردار کی کشش تھی کہ دشمن کی فوج سے منحرف ہوکر بہت سے افراد لشکر امام میں شامل ہوئے۔ امام عالی مقام کے اصحاب میں سے کسی نے کسی مقام پر ایمان کی کمزوری اور بزدلی نہیں دکھائی۔ ضحاک بن عبداللہ مشرقی امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا کہ مولا علیہ السلام میں ایک شرط پر آپ کے لشکر میں شامل ہونا چاہتا ہوں کہ میں جب تک آپ کے لشکر میں رہوں گا کہ میں اور میرا وجود آپ کیلئے مفید ہے۔ لیکن جب دیکھوں گا کہ میرا آپ کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ رہا تو میں آپ سے جدا ہوکر چلا جاؤں گا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ٹھیک ہے آپ ہمارے پاس آجایئے چنانچہ یہ شخص لشکر امام میں شامل ہوگیا۔

عاشورہ کے آخری لمحات تک یہ شخص وہیں رہا اس کے بعد کہنے لگا مولا علیہ السلام اب میں جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا آپ کو کسی قسم کا فائدہ نہیں ہے آپ نے فرمایا ٹھیک ہے اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ اس کے پاس بہت اعلیٰ قسم کا گھوڑا تھا یہ اس پر سوار ہوا اور اس کو ایڑی لگائی اور لشکر یزید کو چیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند یزیدیوں نے ضحاک کا تعاقب کیا وہ اس کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن ان سپاہیوں میں اس کا ایک واقف کار نکل آیا اس نے کہا اسے جانے دیجیے کہ یہ جنگ نہیں کرنا چاہتا۔

انہوں نے اسے جانے دیا اس کے علاوہ کسی ایک شخص نے بھی لشکر امام میں سے اپنے ایمان کی کمزوری نہیں دیکھائی۔لیکن امام حسن علیہ السلام کے اصحاب اگر بزدلی اور کمزوری نہ دکھاتے تو آپ کسی طرح بھی صلح نہ کرتے ایک تو آپ شہید ہو جاتے دوسرے رسوائی ہوتی اس لئے آپ نے مصالحت کی۔

یہ وہ فرق ہے کہ جو ایک کے قیام اور دوسرے کی مصالحت پر منتج ہوا۔جس طرح حضرت علی علیہ السلام امیر شام سے جنگ کے خواہاں تھے کی طرح امام حسن علیہ السلام بھی ان سے لڑنا چاہتے تھے لیکن جب کوفہ والوں کی بے وفائی اور بے پرواہی دیکھی تو آپ نے جنگ کا ارادہ بدل لیا یہاں تک کہ امام علیہ السلام کے لشکر میں بھی کمی واقع ہوگئی، تو آپ نے شہر سے باہر آ کر فوجیوں سے فرمایا آپ نخیلہ مقام پر جائیں اور آپ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو جہاد کی طرف دعوت دی تو سبھی خاموش رہے، اس مجمع میں صرف عدی بن حاتم اپنی جگہ سے اٹھا اور لوگوں کی ملامت کی اور کہا کہ میں خود جاتا ہوں چنانچہ وہ چل پڑا ایک ہزار آدمی بھی اس کے ساتھ چل پڑے اس کے بعد امام حسن علیہ السلام نخیلہ مقام پر تشریف لے گئے اور دس دنوں تک وہیں پر قیام فرمایا۔صرف چار ہزار آدمی جمع ہوئے حضرت دوسری مرتبہ پھر تشریف لائے اور لوگوں کو دوبارہ جہاد کی طرف راغب کیا اس مرتبہ لوگوں کی جمعیت کچھ زیادہ اکٹھی ہوئی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایمان کی کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کیا۔رات ہوئی امیر شام کی طرف سے کچھ لوگ آئے ان کے سرداروں کو پیسے دیئے چنانچہ اسی رات کو وہ لوگ بھاگ کر چلے گئے، ٹولیاں ٹولیاں بنا کر جا رہے تھے۔اس افسوسناک صورت حال کو دیکھ کر حضرت نے مناسب سمجھا کہ ذلت کے بجائے عزت کے ساتھ خاموشی اختیار کی جائے۔

سوال: آپ نے یہ فرمایا کہ اگر امام حسن علیہ السلام صلح نہ کرتے تو تاریخ ان پر اعتراض کر سکتی تھی۔میرے خیال کے مطابق امام علیہ السلام اگر صلحنامہ پر دستخط نہ کرتے تو

ان کی ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، کیونکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ امیر شام ایک چالاک وعیار شخص تھا۔اس نے امام حسن علیہ السلام کی طرف ایک سفید کاغذ بھجوا کر ایک چال کھیلی تھی۔امیر شام کو تو لوگ حضرت امیر علیہ السلام کے زمانہ سے جانتے تھے کہ یہ شخص صرف اور صرف اقتدار کا بھوکا ہے اور کرسی کے حصول کیلئے اس طرح کے حربے استعمال کرتا رہتا ہے؟

جواب: یہ درست ہے کہ امیر شام بہت ہی چالاک انسان تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے اسلامی شرائط کو قبول کیا ہے یا غیر اسلامی کو؟ ظاہر ہے اسلامی شرائط ہی امام علیہ السلام نے قبول فرمائی تھیں۔دوسری بات یہ صلح نامہ ذاتی مقصد اور شخصی مفاد کیلئے نہیں تھا بلکہ اس میں تمام مسلمانوں کے فوائد مضمر تھے۔تیسری بات امام حسن علیہ السلام کے ساتھیوں نے آپ کے ساتھ ہرگز وفا نہ کی۔پھر اس وقت حکومتی مشینری شب و روز پروپیگنڈا کر رہی تھی کہ امیر شام تو امام علیہ السلام کی ہر بات مانتا ہے لیکن امام علیہ السلام نہیں مانتے ظاہر ہے اس وقت کا مورخ یہی لکھتا کہ نعوذ باللہ امام حسن علیہ السلام صلح جو انسان نہیں ہیں حالانکہ امن وسلامتی کا قیام ائمہ طاہرین علیہم السلام کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔آپ نے یہ کہا کہ وہاں کے عوام حضرت امیر علیہ السلام کے زمانہ سے امیر شام کو پوری طرح سے جانتے اور پہچانتے تھے۔کہ وہ اپنی ایک بات پر قائم نہیں رہتا کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ اور ہے دراصل معاملہ کچھ یوں تھا کہ لوگ امیر شام کو اچھا انسان تو نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کے نزدیک وہ حکمران اچھا تھا۔اس لئے بھی کوفہ والے قدرے خاموش ہو گئے۔عوامی ردعمل یہ تھا کہ اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے تو کیا اچھا حکمران تو ہے وہ کہا کرتے تھے کہ امیر شام نے خطہ شام کو کس طرح سنوارا ہے، اور وہاں کے لوگ کس طرح خوشحال ہیں؟ لوگوں نے امیر شام کو اس طرح پہچان رکھا تھا پھر اس کو حکمران ہونے کے باعث پورے ملک پر مکمل قدرت حاصل تھی۔کہا جاتا ہے کہ جس کی

لاٹھی اس کی بھینس۔ اس لئے سبھی خاموش تھے۔ اب ان حالات میں حق وصداقت، سچائی وراستبازی کے پیکر امام حسن علیہ السلام تن تنہا کیا کرتے؟

اس وقت لوگوں میں یہ بات عام تھی کہ امیر شام وقت کا بہت بڑا سیاستدان ہے۔ مورخین نے امیر شام کی اس مقام پر مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وہ کوفہ میں بھی حلم وبرد باری اور اچھے کردار کا عملی مظاہرہ کرتا تو وہ اسلامی ودینی نقطہ نظر سے بھی کامیاب ہوتا۔ امیر شام کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ برد بار سیاستدان ہے۔ لوگ اس کو جا کر سر عام گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے تھے لیکن وہ ان کی تمام باتیں سنی ان سنی کر دیتا تھا، اور ہنستے مسکراتے ہوئے ان کو انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے لوگوں کی سوچ بدل جاتی اور اس کی اس بات پر لوگ بہت زیادہ خوش ہو گئے تھے کہ امیر شام دنیا دار حکمران ہے۔ امام حسن علیہ السلام اس لئے خاموش ہو گئے تھے کہ وہ لوگوں کے اذہان پیسوں سے خرید لیا کرتا تھا۔ لوگوں کو اس سے غرض نہ تھی کہ وہ نیک ہو، اچھا ہو، دیندار ہو۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ جو حکومتی امور کو با آحسن چلا سکے۔

امیر شام کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک جاہ طلب اقتدار کا بھوکا انسان تھا (جس طرح آج کے دور میں قومی وصوبائی اسمبلیوں کو خریدا جاتا ہے اس وقت بھی امیر شام اعتراض کرنے والے کو پیسے دے کر خاموش کرا دیتا تھا بلکہ اس کے بڑے بڑے مخالف مالی ومادی لالچ کی وجہ سے اس کے ساتھی بن گئے) اب آپ ہی فرمایئے کہ امام حسن علیہ السلام صلح نامہ پر دستخط کر کے گوشہ تنہائی میں نہ بیٹھیں تو کیا کریں۔ واقعتاً حالات نے امام علیہ السلام کو بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔

سوال: کیا امام حسین علیہ السلام نے اس صلحنامہ پر دستخط کیے تھے؟ کیا آپ نے اپنے بھائی جان امام حسن علیہ السلام پر اعتراض نہیں کیا تھا یا روکا نہیں تھا کہ وہ بیعت

نہ کریں؟

جواب: میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ مولا امام حسین علیہ السلام نے بھی اس پر دستخط کیے ہوں دراصل آپ کی اجازت اور آپ کے دستخطوں کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اس وقت کے امام اور دینی سربراہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام تھے۔ جب ایک سربراہ موجود ہوتا ہے تو دوسرے کے احکامات اور آراء کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ امام حسین علیہ السلام کا فیصلہ بھی وہی تھا جو امام حسن علیہ السلام کا تھا۔ صلح کے بعد ایک گروہ امام حسین علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کی مولا علیہ السلام ہم اس صلح کو قبول نہیں کرتے۔ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں اور آپ قیام فرمایئے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا میرے پیارے بھائی جناب حسن علیہ السلام نے جو کچھ کیا ہے صحیح کیا ہے میں تو ان کے فرامین پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام کی سوچ ایک تھی۔ امام حسن کی ذات گرامی امام حسین علیہ السلام کیلئے ایک معتبر حوالہ اور حرف آخر کے طور پر حیثیت رکھتی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ امیر شام کے مذاکرات اور صلحنامہ کے وقت امام حسین علیہ السلام نے مشورہ دینے کی بھی کوشش نہیں کی کیونکہ امام حسین علیہ السلام بخوبی جانتے تھے کہ اس وقت کے محمد، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی، علیہ السلام حسن علیہ السلام ہی ہیں۔ جو کہیں گے سچ کہیں گے اور جو کریں گے ٹھیک کریں گے۔ کیونکہ وہ وقت کے امام اور وقت کے سب سے بڑے دانائے راز ہیں اور امام کبھی خطاء نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی سوچ الٰہی ہوتی ہے۔ امام علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے۔ غلطی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ (میرے نزدیک امام حسن علیہ السلام کے مدبرانہ اقدام پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی مرتضیٰ علیہ السلام نے انہیں داد تحسین دی ہوگی اور جناب فاطمۃ الزہراء علیہا السلام نے دعائیں دی ہونگی۔ امام حسین علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اپنے جلیل القدر بھائی کو گلے لگایا ہوگا۔ جناب جبرائیل امین علیہ السلام نے اس منظر کو دیکھ کر ملائکہ کو نوید مسرت دی ہوگی کہ آج کا محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آج کا علی علیہ السلام کس احسن طریقہ سے دین الٰہی کی تبلیغ کے فرائض انجام دے رہا ہے؟ ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ مولا علیہ السلام آپ نے ان کربناک لمحوں میں جس حسن تدبر کا مظاہرہ کیا ہے اس پر آپ کو پوری انسانیت خراج تحسین پیش کرتی ہے۔)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا نام نامی، اسم گرامی روحانی اقدار کے ہیرو کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ زہد وتقویٰ اور عبادت سمیت انسان کی تمام خوبیوں اور اعلیٰ صفات وکمالات کو دیکھا جائے تو وہ ایک ایک کر کے امام سجاد علیہ السلام میں واضح طور پر موجود ہیں، جب خاندان رسالت پر نظر ڈالتے ہیں تو امام سجاد علیہ السلام چودھویں کے چاند کی مانند دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس عظیم خاندان کا ہر فرد اپنے اپنے عہد کا بے مثال انسان ہوتا ہے۔ ایسا انسان کہ انسانیت اس پر فخر کرے۔ اگر ہم ان کے کردار وعمل کو دیکھیں تو ہمیں ماننا پڑے گا اسلام کی تمام تر جلوہ آفرینیاں، ایمان کی ساری ساری ضوفشانیاں آپ میں موجود ہیں۔ جب ہم حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی کو دیکھتے ہیں تو آپ کے کمالات وصفات کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ آپ کا ہر کام اتنا بلند ہے کہ اس تک پہنچنا تو درکنار آدمی ان کے بارے سوچ بھی نہیں سکتا اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ صاف ظاہر ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کیلئے معجزانہ طور پر پیدا ہوا ہو اور اس کی تربیت بھی خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی ہو پھر ساری زندگی سرور کائنات کے نام وقف کردی ہو۔ بھلا اس عظیم انسان کی عظمت ورفعت کا کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سایہ بن کر ساتھ چلنے والا علی علیہ السلام پیغمبر السلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت بن چکا تھا۔ گویا یک جان دو قالب ہوں۔ جب انسان علی علیہ السلام کو دیکھتا ہے تو ان کی سیرت طیبہ کے آئینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نور کی سیرت نظر آتی ہے (اسی طرح آپ کی تمام اولاد میں ایک جیسی صفات ہیں۔ زمانہ ہزار رنگ بدلے علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام کبھی اور کسی دور میں نہیں بدل سکتے۔ کیونکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی

تقدیر کا اٹل فیصلہ ہیں اور اس کا ہر فیصلہ ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔

عبادت امام علیہ السلام

اہل بیت علیہم السلام کی عبادت کا انداز بھی ایک جیسا ہے دنیا کی ہر چیز میں دھوکے کا امکان ہے لیکن آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہیں کہ جن میں حقیقت کے سوا کچھ نہیں نظر آتا۔ انسان جب امام زین العابدین علیہ السلام کو دیکھتا ہے تو آپ کو صحیح معنوں میں خدا کا مخلص بندہ پاتا ہے، اور بیساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ بندہ ہو تو ایسا ہو اور بندگی ہو تو ایسی۔ آپ کی نماز خالص بندگی سے خالص عبادت تھی۔ آپ کی دعاؤں کا سوز اڑتے ہوئے پرندوں کو روک لیتا۔ راہ گزرتے لوگ رک کر فرزند حسین علیہ السلام کی رقت آمیز آواز کو سن کر گریہ کرتے۔ مسٹر کارل کہتا ہے کہ انسان کی روح اللہ کی طرف پرواز کرتی ہے (بیشک اگر کوئی نمازی کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور اس کی روح ادھر ادھر اڑتی پھرے تو یہ ایسی روح ہے کہ جو اس جسم سے جا چکی ہو) انسان جب سید سجاد علیہ السلام کے سجدوں، کو دیکھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ روح انسان کا حسن کیا ہے؟

اینہمہ آواز ہا از شہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

"یعنی یہ تمام آوازیں مولا ہی کی تھیں اگرچہ وہ ان کے فرزند شیر خوار کے حلق سے آ رہی تھیں۔"

جب کوئی انسان حضرت زین العابدین علیہ السلام کو دیکھتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محراب عبادت میں محو عبادت ہوں، یا رات کے تیسرے پہر

میں کوہ حرا میں اپنے رب سے راز و نیاز کر رہے ہوں۔ ایک رات آپ عبادت الٰہی میں مصروف تھے کہ آپ کا ایک صاحبزادہ کہیں پہ گر پڑا اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔ اب اس بچے کو پٹیوں کی ضرورت تھی آپ کے گھر والوں نے مناسب نہ سمجھا کہ آپ کی عبادت میں مخل ہوں۔ گھر میں ایک جراح کو بلایا گیا اس نے جب بچہ کو پٹی باندھی تو وہ چلا اٹھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کے بعد خاموش ہو گیا اور رات کا سارا واقعہ آپ کو بتایا گیا آپ اس وقت عبادت کر رہے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام عبادت خداوندی میں اس قدر منہمک ہوتے اور آپ کی روح خدا کی طرف اس طرح پرواز کرتی تھی کہ عبادت کے وقت آپ کے کانوں پر کوئی بھی آواز نہ پڑتی تھی۔

پیکر محبت

امام زین العابدین علیہ السلام خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ جب بھی آپ کہیں پر جاتے اور راستے میں کسی غریب وفقیر اور مسکین کو دیکھتے تو آپ کے قدم رک جاتے اور فوراً اس بیکس کی مدد کرتے اور بیکسوں، بے نواؤں کی دلجوئی کرنا، ان کو سہارا دینا اور ان کی ضرورت پوری کرنا آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا تھا آپ اس کی دوسروں سے بڑھ کر ڈھارس بندھاتے۔ اس کو اپنے در دولت پر لے آتے اور اس کی ضرورت پوری کرتے تھے ایک روز آپ کی نظر ایک جذامی شخص (کوڑھ کے مریض) پر پڑی، لوگ اس سے نفرت کرتے ہوئے آگے گزر جاتے تھے۔ کوئی بھی اس سے بات کرنا گوارا نہ کرتا تھا، آپ اس کو اپنے گھر میں لے آئے۔ اس کی خوب خاطر مدارت کی۔ آپ ہر مسکین وضرورت مند سے کہا کرتے تھے کہ آپ لوگوں کو جب بھی کوئی مشکل آئے تو سید سجاد علیہ السلام کا دروازہ آپ

کیلئے کھلا ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا گھر مسکینوں، یتیموں اور بے نواؤں کا مرکز ہوا کرتا تھا (آپ ایک سایہ دار شجر کی طرح دوسروں پر سایہ کرتے، مہربانی وعطوفت سے پیش آتے اور ان کی مشکل و پریشانی کو دور کرتے تھے)۔

کاروان حج کی خدمت کرنا

امام سجاد علیہ السلام حج پر تشریف لے جا رہے تھے آپ نے اس قافلہ کو جانے دیا جو آپ کو جانتے تھے اور ایک اجنبی قافلہ کے ساتھ ایک مسافر اور پردیسی کے طور پر شامل ہو گئے۔ آپ نے ان سے کہا کہ میں آپ لوگوں کی خدمت کرتا جاؤں گا۔ انہوں نے بھی مان لیا۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے سفر میں بارہ دن لگتے تھے، امام علیہ السلام اس مدت میں تمام قافلہ والوں کی خدمت کرتے رہے۔ اثناء سفر میں یہ قافلہ دوسرے قافلہ کے ساتھ جا ملا ان لوگوں نے امام علیہ السلام کو پہچان لیا اور دوڑ کر آپ کی خدمت میں آئے عرض کی مولا علیہ السلام آپ کہاں؟ امام نے سب کی خیرت دریافت کی انہوں نے اس قافلے سے پوچھا کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں یہ ایک مدنی نوجوان ہے اور بہت ہی متقی اور پرہیزگار ہے۔ وہ بولے تمہیں خبر نہیں یہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہیں، اور آپ ہیں کہ امام سے کام لئے جا رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ امام کے قدموں میں گر پڑے عرض کی مولا آپ ہمیں معاف کر دیجئیے کہ ہم نے لا علمی کی بناء پر آپ کی شان میں گستاخی کی کہاں آپ کی عظمت و رفعت اور کہاں ہماری پستی ؟

ہم پر کہیں عذاب الٰہی نہ آ پڑے۔ آپ ہمارے آقا و مولا علیہ السلام ہیں۔

آپ کو سرداری کی مسند پر بیٹھنا چاہیے تھا۔ اب آپ تشریف رکھیں ہم آپ

کی خدمت کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں انجان اور اجنبی بن کر آپ لوگوں کے قافلہ میں اس لئے شامل ہوا تھا کہ آپ زائرین بیت اللہ ہیں، آپ کی خدمت کر کے ثواب حاصل کروں، آپ فکر نہ کریں میں نے جو بھی خدمت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب مجھ کو ملے گا

امام علیہ السلام کا دعا مانگنا اور گریہ کرنا

جس طرح آپ کے پدر بزرگوار حضرت حسین علیہ السلام کو کام کرنے کا موقعہ نہ دیا گیا اسی طرح آپ بھی مصیبتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے وہ نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ وقت امام جعفر صادق علیہ السلام کو میسر ہوا اور آپ نے بہت کم مدت میں علم وعمل کی ایک دنیا آباد کر دی۔ آپ نے علوم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا بھر میں پھیلایا۔ بہرکیف جو شخص اسلام کا سچا خدمت گزار ہو وہ تمام مقامات میں رضائے الٰہی کو مدنظر رکھتا ہے، وہ مشکلات اور سہولیات کو نہیں دیکھتا، بس کام کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رب العزت کی طرف سے بلاوا آ جاتا ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی عبادت کو دیکھ کر اور دعاؤں کو پڑھ کر ملت جعفریہ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، آپ کی دعا میں التجا بھی ہے اور دشمنوں کے خلاف احتجاج بھی۔ آپ کی دعا میں تبلیغ بھی ہے اور خوشخبری بھی۔ گویا برکتوں، رحمتوں کی ایک موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔

بعض لوگوں کا زعم باطل ہے کہ چونکہ امام سجاد علیہ السلام نے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد تلوار کے ذریعہ جہاد نہ کیا اس لئے آپ نے دعاؤں پر اکتفاء کی اور غموں کو دور کرنے کیلئے ہر وقت دعا مانگا کرتے تھے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے آپ نے اپنے والد گرامی کو زندہ کرنے کیلئے اس کی یاد کو ہر وقت تازہ کیے رکھا۔ دنیا والوں کو معلوم ہونا چاہیے کربلا کو کربلا بنایا ہی سید سجاد علیہ السلام نے ہے۔ آپ کا اپنے پیاروں کی یاد میں

گریہ کرنا بھی جہاد تھا۔ آپ دنیا والوں کو بتانا چاہتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کا مقصد قیام کیا تھا۔ آپ نے اتنی تکلیفیں پریشانیاں برداشت کیوں کی؟ آپ پر ظلم کیوں ہوا اور کس نے کیا؟ یہ سب کچھ سید سجاد علیہ السلام ہی نے بتایا ہے۔ (میرے نزدیک امام سجاد علیہ السلام کی مصیبت کا باب ہی سب ائمہ علیہ السلام کے مصائب سے الگ اور انوکھا ہے۔ خدا جانے کتنا مشکل وقت ہوگا جب یزید ملعون منبر پر بیٹھ کر نشے سے مدہوش ہو کر امام مظلوم کے سر اقدس کی توہین کر کے اپنے مظالم کو فتح و کامیابی سے تعبیر کر رہا تھا۔ پھر کتنا کٹھن مرحلہ تھا وہ جب مخدرات عصمت کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا تھا کہ یہ بی بی کون ہے اور وہ بی بی کون؟ یہ جناب سید سجاد علیہ السلام ہی کا دل تھا جو نہ سہنے والے غم بھی بڑی بے جگری سے سہتا رہا۔ یہ وہ غم تھے کہ پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ پھر والد گرامی اور شہدائے کربلا کی شہادت کے بعد آپ نے جس انداز میں یزیدیت کا جنازہ نکالا اور اپنے عظیم بابا کا مقصد شہادت بیان کیا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ بول اٹھا سید سجاد علیہ السلام! تیری عظمتوں کا کیا کہنا۔

آپ علیہ السلام واقعہ کربلا کے بعد ہر وقت گریہ کرتے رہتے۔ اشکوں کا سیلاب تھا جو رکتا نہیں تھا۔ آنسو تھے کہ بہتے رہتے تھے، ہائے حسین علیہ السلام، ہائے میرے عزیز جوانو، ہائے راہ حق میں قربان ہو جانے والو! سجاد تمہاری بے نظیر قربانیوں اور بے مثال وفاؤں کو سلام پیش کرتا ہے۔ آہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غم کا وہ کوہ گراں! جب تک یہ دنیا باقی ہے غم شبیر سلامت رہے گا۔ ایک روز آپ کے ایک غلام نے پوچھ ہی لیا کہ آقا آخر کب تک روتے رہیں گے۔ اب تو صبر کیجیئے۔ اس نے خیال کیا تھا کہ امام علیہ السلام شاید اپنے عزیزوں کو یاد کر کے روتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تو کیا کہتا ہے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک بیٹا یوسف علیہ السلام ان کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا کہ قرآن مجید کے بقول:

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

کہ روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہوگئی تھیں۔ (سورہ یوسف، ۸۴)

میں نے اپنی آنکھوں سے اٹھارہ یوسف تڑپتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں کس طرح ان کو بھلا دوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اور مسئلہ خلافت

اس وقت ہم مسئلہ امامت وخلافت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ مسئلہ صلح امام حسن علیہ السلام پر بات چیت ہوچکی امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔ اس سلسلے میں کئی سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب دینا بہت ضروری ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام رضا علیہ السلام، حضرت امام صادق علیہ السلام کی خلافت حقہ کے بارے میں کچھ اعتراضات سننے کو آئے ہیں، میں چاہتا ہوں ان کا تفصیل کے ساتھ جواب دوں، ایسا جواب کہ جس کے بعد کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ لیکن میں اس وقت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ امام علیہ السلام کے بارے میں دو سوالات ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور امامت بنی امیہ کی حکومت کے آخری ایام اور بنی عباس کے اوائل اقتدار میں شروع ہوتا ہے۔

سیاسی اعتبار سے امام علیہ السلام کے لئے بہترین موقعہ ہاتھ میں آیا۔ بنی عباس نے تو اس موقعہ پر بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھالیا۔ امام علیہ السلام نے ان سنہری لمحوں سے استفادہ کیوں نہیں کیا؟ بنی امیہ کا اقتدار زوال پذیر تھا۔ عربوں اور ایرانیوں، دینی اور غیر دینی حلقوں میں بنی امیہ کے بارے میں شدید ترین مخالفت وجود میں آچکی تھی۔ دینی حلقوں میں مخالفت کی وجہ ان کا علانیہ طور گناہوں کا ارتکاب کرنا تھا۔ دیندار طبقہ کے نزدیک بنی امیہ فاسق وفاجر اور نالائق لوگ تھے؟ اس کے علاوہ انہوں نے بزرگان اسلام اور دیگر دینی شخصیات پر جو مظالم ڈھائے ہیں وہ انتہائی قابل مذمت اور لائق نفرت تھے۔ اس طرح کی کئی مخالف وجوہات نفرت واختلاف کا باعث بن

چکی تھیں" خاص طور پر امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے بنی امیہ کے ناپاک اقتدار کو خاک میں ملا دیا۔ پھر رہی سہی کسر جناب زید بن علی ابن الحسین اور یحیٰی بن زید کے انقلابات نے نکال دی۔ مذہبی اور دینی اعتبار سے اموی خاندان کا اثر ورسوخ بالکل ناپید ہوگیا تھا۔ بنی امیہ علانیہ طور پر فسق وفجور کے مرتکب ہوئے تھے، عیاشی اور شرابخوری میں تو انہوں نے بڑے بڑے رنگین مزاج حکمرانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اوران کو لادین عناصر سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ کچھ حکمران ظلم وستم کے حوالے سے بہت ظالم وسفاک شمار کیے جاتے تھے ان میں ایک نام سلاطین بنی امیہ کا ہے۔ عراق میں حجاج بن یوسف اور خراسان میں چند حکمرانوں نے ایرانی عوام پر مظالم ڈھائے۔ وہ لوگ بنی امیہ کے مظالم کو ان مظالم کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ اس لئے شروع ہی سے اسلام اور خلافت میں تفریق قائم کی گئی خاص طور پر علویوں کی تحریک خراسان میں غیر معمولی طور پر مؤثر ثابت ہوئی۔ اگر چہ یہ انقلابی لوگ خود تو شہید ہوگئے لیکن ان کے خیالات اور ان کی تحریکوں نے مردہ قوموں میں جان ڈال دی۔ اوران کے نتائج لوگوں پر بہت اچھے مرتب ہوئے۔

جناب زید بن زین العابدین علیہ السلام نے کوفہ کی حدود میں انقلاب برپا کیا وہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ عہد وپیمان کیا اور آپ کی بیعت کی، لیکن چند افراد کے سوا کوفیوں نے آپ کے ساتھ وفا نہ کی، جس کی وجہ سے اس عظیم سپوت اور بہادر و جری نوجوان کو بڑی بیدردی کے ساتھ شہید کردیا گیا۔ ان ظالموں نے آپ کی قبر پر دو مرتبہ پانی چھوڑ دیا تاکہ لوگوں کو آپ کی قبر مبارک کے بارے میں پتہ نہ چل سکے، لیکن وہ چند دنوں کے بعد پھر آئے قبر کو کھود کر جناب زید کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا اور کچھ دنوں تک اسی حالت میں لٹکتی رہی اور کہا بالآخر وہ لاش خشک ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ جناب زید کی لاش چار سالوں تک سولی پر لٹکتی رہی۔ جناب زید کا ایک انقلابی بیٹا تھا ان

کا نام یحییٰ تھا۔انہوں نے انقلاب برپا کیا لیکن کامیاب نہ ہوسکے اور خراسان چلے گئے۔ پھر جناب یحییٰ بنی امیہ کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔آپ کی محبت لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی چلی گئی۔آپ کی شہادت کے بعد خراسان کے عوام کو پتہ چلا کہ خاندان رسالت کے ان نوجوانوں نے ایک ظالم حکومت کے خلاف جہاد کیا اور خود اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔اس زمانے میں خبریں بہت دیر سے پہنچا کرتی تھیں۔جناب یحییٰ نے امام حسین علیہ السلام اور جناب زید کی شہادت کو از سرنو زندہ کردیا۔لوگوں کو بعد میں پتہ چلا کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی امیہ کے خلاف کس پاکیزہ مقصد کے تحت قیام کیا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں جب جناب یحییٰ شہید ہوئے تو خراسان کے عوام نے ستر (۷۰) روز تک سوگ منایا۔اس سے معلوم ہوتا ہے انقلابی سوچ رکھنے والے لوگوں کا اثر پہلے ہی سے تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے لوگوں کے اذہان میں انقلابی اثرات گھر کرتے جاتے ہیں۔ایک انقلابی اپنے اندر کئی انقلاب رکھتا ہے۔بہرحال خراسان کی سرزمین ایک بڑے انقلاب کیلئے سازگار ہوگئی۔لوگ بنی امیہ کے خلاف کھلے عام نفرت کرنے لگے۔

بنی امیہ کے خلاف عوامی ردعمل اور بنی عباس بنو عباس نے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو خوب مستحکم و مضبوط کیا، یہ تین بھائی تھے ان کے نام یہ ہیں۔ابراہیم امام، ابوالعباس سفاح اور ابوجعفر منصور یہ تینوں عباس بن عبدالمطلب کی اولاد سے ہیں۔یہ عبداللہ کے بیٹے تھے۔عبداللہ بن عباس کا شمار حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہوتا ہے۔اس کا علی نام سے ایک بیٹا تھا۔اور علی کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا" پھر عبداللہ کے تین بیٹے تھے۔ابراہیم، ابوالعباس سفاح اور ابوجعفر، یہ تینوں بہت ہی باصلاحیت، قابل ترین افراد تھے۔ان تینوں بھائیوں نے بنی امیہ کے آخری دور

حکومت میں بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھایا۔وہ اس طرح کہ انہوں نے خفیہ طور پر مبلغین کی ایک جماعت تیار کی اور پس پردہ انقلابی پروگرام تشکیل دینے میں شب و روز مصروف رہے۔اور خود حجاز و عراق اور شام میں چھپے رہے، ان کے نمائندے اطراف واکناف میں پھیل کر امویوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے، خاص طور پر خراسان میں ایک عجیب قسم کا ماحول بن چکا تھا۔لیکن ان کی تحریک کا پس منظر منفی تھا یہ کسی اچھے انسان کو اپنے ساتھ نہ ملاتے۔یہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے میں صرف ایک شخصیت کا نام استعمال کرکے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے۔اس سے معلوم ہوا کہ عوام کی توجہ کا مرکز آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تھے۔ان عباسیوں نے ایک کھیل کھیلا کہ ابومسلم خراسانی کا نام استعمال کیا اس سے ان کا مقصد ایرانی عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔

وہ قومی تعصب پھیلا کر بھی لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے، وقت کی قلت کے پیش نظر میں اس مسئلہ پر مزید روشنی نہیں ڈالنا چاہتا، البتہ میرے اس مدعا پر تاریخی شواہد ضرور موجود ہیں۔ان کو بھی لوگ بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔لیکن بنی امیہ سے نجات حاصل کرنے کیلئے وہ ان کو اقتدار پر لے آنا چاہتے تھے۔بنی امیہ ہر لحاظ سے اپنا مقام کھو چکے تھے، اگرچہ بنی امیہ ظاہری طور پر خود کو مسلمان کہلواتے تھے۔لیکن ان کا اسلام سے دور تک واسطہ نہ تھا۔خراسان میں ان کا اثر و رسوخ بالکل نہ تھا کہ لوگوں کو اس وقت کی حکومت کے خلاف اکٹھا کرسکیں اور خراسان کی فضا میں ایک خاص قسم کا تلاطم پیدا ہوچکا تھا، اگرچہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ خلافت اور اسلام ہر دونوں کو اپنے پروگرام سے خارج کردیں، لیکن نہ کرسکے، اور یہ اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کی ترقی کا نام استعمال کرکے آگے بڑھتے گئے اور سال ۱۲۹ کے پہلے دن مرو کے ایک قصبے" سفید نج" میں اپنے قیام کا رسمی طور پر اعلان کیا۔عید الفطر کا دن تھا۔نماز عید کے بعد اس انقلاب کا اعلان کیا گیا، انہوں نے اپنے پرچم پر اس آیت کو

تحریر کیا اور اسی آیہ کو اپنے انقلابی اہداف کا ماٹو قرار دیا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

" جن (مسلمانوں) سے (کفار) لڑا کرتے تھے چونکہ وہ (بہت) ستائے گئے اس وجہ سے انہیں بھی (جہاد کی) اجازت دے دی گئی اور خدا تو ان لوگوں کی مدد پر یقیناً قادر (وتوانا) ہے۔" (حج، ۳۹)

پھر انہوں نے سورہ حجرات کی آیہ نمبر ۱۳ کو اپنے منشور میں شامل کیا ارشاد خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ

لوگو ہم نے تو سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب سے بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔"

اس آیت سے بنی نوع انسان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اسلام اگر کسی کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اس کا متقی ہونا ہے۔ چونکہ اموی خاندان عربوں کو غیر عربوں پر ترجیح دیتے تھے اسلام نے ان کے اس نظریہ کی نفی کر کے ایک بار پھر اپنے دستور کی تائید کی ہے کہ خاندانی وجاہت، مالی آسودگی کو باعث فخر سمجھنے والو! تقویٰ ہی معیار انسانیت ہے۔

ایک حدیث ہے اور اس کو میں نے کتاب اسلام اور ایران کا تقابلی جائزہ

سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ہے یا ایک صحابی نے نقل کیا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ سفید رنگ کے گوسفند کالے رنگ کے گوسفند میں داخل ہو گئے اور یہ ایک دوسرے سے ملے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کی اولاد پیدا ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس خواب کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی کہ عجمی اسلام میں تمہارے ساتھ شرکت کریں گے، اور آپ لوگوں میں شادیاں کریں گے۔ آپ کی عورتیں ان کے مردوں اور ان کی عورتیں آپ کے مردوں کے ساتھ بیاہی جائیں گی۔ یعنی آپ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رشتے کریں گے۔ میں نے اس جملہ سے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک روز تم عجم کے ساتھ اور عجم تمہارے ساتھ اسلام کی خاطر جنگ کریں گے یعنی ایک روز تم عجم کے ساتھ جنگ کر کے انہیں مسلمان کریں گے اور ایک روز عجم تمہارے ساتھ لڑیں گے اور تمہیں اسلام کی طرف لوٹائیں گے اس حدیث کا مفہوم یہی ہے کہ اس قسم کا انقلاب آئے گا۔

بنی عباس انتہائی مضبوط پروگرام اور ٹھوس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے تحریک کو پروان چڑھا رہے تھے۔ ان کا طریقہ کار بہت عمدہ اور منظم تھا انہوں نے ابومسلم کو خراسان اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے بھیجا تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ انقلاب ابومسلم کے نام پر کامیاب ہو بلکہ انہوں نے چند مبلغوں کو خراسان بھیجا کہ جا کر لوگوں میں اچھے انداز میں تقریریں کر کے عوام کو امویوں کے خلاف اور عباسیوں کے حق میں جمع کریں۔ ابومسلم کے نسب کے بارے میں آج تک معلوم نہیں ہو سکا تاریخ میں تو یہاں تک بھی پتہ نہیں ہے کہ ابومسلم ایرانی تھے یا عربی؟ پھر اگر ایرانی تھے تو پھر کیا اصفہانی تھے یا خراسانی؟ وہ ایک غلام تھا اس کی عمر ۲۴ برس کی تھی کہ ابراہیم امام نے اس غیر معمولی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اس کو تبلیغ کے لئے خراسان روانہ کیا تاکہ وہ خراسان کے عوام کے اندر ایک انقلاب برپا کر دے۔ اس نوجوان میں قائدانہ صلاحیتیں بھرپور

طریقے سے موجود تھیں۔ یہ شخص سیاسی لحاظ سے تو خاصا باصلاحیت تھا لیکن حقیقت میں بہت برا انسان تھا۔ اس میں انسانیت کی بو تک نہ آتی تھیں۔ ابو مسلم حجاج بن یوسف کی مانند تھا، اگر عرب حجاج پر فخر کرتے ہیں تو عجمی ابو مسلم پر فخر کرتے ہیں۔

حجاج بہت ہی زیرک اور ہوشیار انسان تھا۔ اس میں قائدانہ صلاحتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں، لیکن وہ انسانیت کے حوالے سے بہت ہی پست اور کمینہ شخص تھا۔ اس نے اپنے زمانہ اقتدار میں بیس ہزار آدمی قتل کیے اور ابو مسلم کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے چھ لاکھوں آدمی قتل کیے۔ اس نے معمولی بات پر اپنے قریبی دوستوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ ایرانی ہے یا عربی کہ ہم کہہ سکیں کہ وہ قومی تعصب رکھتا تھا۔

میں نہیں سمجھتا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس تحریک میں کسی قسم کی مداخلت کی ہو، لیکن بنوعباس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا یہ نعرہ تھا کہ وہ بنی امیہ سے خلافت ہر صورت میں لے کر رہیں گے۔ اس کیلئے وہ کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ یہاں پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ بنوعباس کے پاس دو اشخاص ایسے ہیں کہ جو شروع سے لے کر آخر تک تحریک عباسیہ کی قیادت کرتے رہے۔ ایک عراق میں تھا اور وہ پس پردہ کام کر رہا تھا اور دوسرا خراسان میں، اور جو کوفہ میں تھا وہ تاریخ میں ابوسلمہ خلال کے نام سے مشہور ہے اور جو خراسان میں تھا اس کا نام ابو مسلم ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کو بنی عباس نے خراسان روانہ کیا اور اس نے بہت کم مدت میں بے شمار کامیابیاں سمیٹیں۔ ابوسلمہ کی حیثیت صدر اور ابو مسلم کی ایک وزیر کی تھی۔ یہ پڑھا لکھا شخص، سمجھدار سیاستدان اور بہترین منتظم تھا۔ گفتگو کرتے وقت دوسروں کو متاثر کر دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو مسلم ابوسلمہ سے حسد کرتا تھا۔ جب اس نے خراسان میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تو ابوسلمہ کو درمیان سے ہٹا دیا اور ابوعباس سفاح کے نام ابوسلمہ

کے خلاف ڈھیر سارے خط لکھ ڈالے، اور اس کو خطرناک شخص کے طور پر متعارف کروایا اور کہا کہ اس کو تحریک سے خارج کر دیجئے۔ اس نے اسی قسم کے خطوط بنی عباس کے مختلف اشخاص کی طرف ارسال کیے۔

لیکن سفاح نے اس کے اس مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ مخلصانہ طویل خدمات کے صلے میں ابوسلمہ کے خلاف کسی قسم کا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ پھر اعتراض کرنے والوں نے سفاح سے شکایت کی کہ ابوسلمہ اندر سے کچھ ہے اور باہر سے کچھ اور، وہ چاہتا ہے کہ آل عباس سے خلافت لے کر آل ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کرے۔ یہ سن کر سفاح نے کہا مجھ پر اس قسم کے الزام کی حقیقت ثابت نہ ہو سکی اگر ابو سلمہ اس طرح کی سوچ رکھتا ہے کہ وہ ایک انسان کی حیثیت سے اس طرح کی غلطی کر سکتا ہے۔ وہ ابوسلمہ کے خلاف جتنی بھی کوششیں کرتا تھا کارگر ثابت نہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ ابوسفاح ابوسلمہ اس کو کسی نہ کسی حوالے سے نقصان دے سکتا ہے۔ اس لئے اس نے اس کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ ابوسلمہ کی عادت تھی کہ وہ سفاح کے ساتھ رات گئے تک رہتا وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ایک رات وہ سفاح سے ملاقات کر کے واپس آ رہا تھا کہ ابو مسلم کے ساتھیوں اس کو قتل کر دیا۔ چونکہ سفاح کے کچھ آدمی اس قتل میں شریک تھے اس لئے ابوسلمہ کا خون کسی شمار میں نہ آ سکا۔ یہ واقعہ سفاح کے اقتدار کے ابتدائی دنوں میں پیش آیا۔ اس سانحہ کی کچھ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان میں کچھ محرکات یہ بھی ہیں۔

ابوسلمہ کا خط

امام جعفر صادق علیہ السلام اور عبداللہ محض کے نام

مشہور مورخ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ابوسلمہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اس فکر میں مستغرق رہتا تھا کہ خلافت آل عباس سے لے کر آل ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کرے۔ اگر چہ وہ شروع میں آل عباس کیلئے کام کرتا رہا۔ ۱۳۲ھ میں جب بنی عباس نے رسمی طور پر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اس وقت ابراہیم امام شام کے علاقہ میں کام کرتا تھا لیکن وہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ وہ بھائیوں میں سے بڑا تھا۔ اس لئے اس کی خواہش تھی کہ وہ خلیفہ وقت بنے لیکن وہ بنی امیہ کے آخری دور میں خلیفہ مروان بن محمد کے ہتھے چڑھ گیا اور اس کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر اس کے خفیہ ٹھکانے کا کسی کو پتہ چل گیا تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے ایک وصیت نامہ لکھ کر مقامی کسان کے ذریعے اپنے بھائیوں کو بھجوایا۔ وہ کوفہ کے نواحی قصبے حمیمہ میں مقیم تھے، اس نے اس وصیت نامے میں اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں اپنی حالیہ پالیسی کے بارے میں اعلان کیا اور اپنا جانشین مقرر کیا اور اس میں اس نے یہ لکھا کہ اگر میں آپ لوگوں سے جدا ہو گیا تو میرا جانشین سفاح ہوگا (سفاح منصور سے چھوٹا تھا) اس نے اپنے بھائیوں کو حکم دیا کہ وہ یہاں سے کوفہ چلے جائیں اور کسی خفیہ مکان میں جا کر پناہ لیں اور انقلاب کا وقت قریب ہے۔ اس کو قتل کر دیا گیا اور اس کا خط اس کے بھائیوں کے پاس پہنچایا گیا۔ وہ وہاں سے چھپتے چھپاتے کوفہ چلے آئے اور ایک لمبے عرصے تک وہیں پہ مقیم رہے۔ ابوسلمہ بھی کوفہ میں چھپا ہوا تھا اور تحریک کی قیادت کر رہا تھا دو تین مہینوں کے اندر اندر یہ لوگ رسمی طور پر ظاہر ہوئے اور جنگ کر

کے بہت بڑی فتح حاصل کی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ اس انقلاب کے بعد ابراہیم امام کو قتل کر دیا گیا۔ حکومت سفاح کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس واقعہ کے بعد ابوسلمہ کو پریشانی لاحق ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ خلافت کیوں نہ آل عباس سے لے کر آل ابو طالب کے حوالے کی جائے۔ اس نے دو علیحدہ علیحدہ خطوط لکھے ایک خط امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کیا اور دوسرا خط عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام کے نام ارسال کیا۔ (حضرت امام حسن علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام حسن تھا جسے حسن مثنیٰ سے یاد کیا جاتا ہے یعنی دوسرے حسن، حسن مثنی کربلا میں شریک جہاد ہوئے لیکن زخمی ہوئے اور درجہ شہادت پر فائز نہ ہو سکے۔

اس جنگ میں ان کی ماں کی طرف سے ایک رشتہ داران کے پاس آیا اور عبیداللہ ابن زیاد سے سفارش کی کہ ان کو کچھ نہ کہا جائے۔ حسن مثنیٰ نے اپنا علاج معالجہ کرایا اور صحت یاب ہو گئے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے ایک کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ماں کے لحاظ سے امام حسین علیہ السلام کے نواسے تھے اور باپ کی طرف سے امام حسن علیہ السلام کے پوتے تھے۔ آپ دو طریقوں سے فخر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ میں دو حوالوں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹا ہوں۔ اسی وجہ سے ان کو عبداللہ محض کہا جاتا تھا۔ یعنی خالصتاً اولاد پیغمبر، عبداللہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں اولاد امام حسن علیہ السلام کے سربراہ تھے، جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اولاد امام حسین علیہ السلام کے سربراہ تھے۔)

ابوسلمہ نے ایک شخص کے ذریعہ سے یہ دو خطوط روانہ کیے، اور اس کو تاکید کی کہ اس کی خبر کسی کو بھی نہ ہو۔ خط کا خلاصہ یہ تھا کہ خلافت میرے ہاتھ میں ہے۔ خراسان بھی میرے پاس ہے اور کوفہ پر بھی میرا کنٹرول ہے، اور اب تک میری ہی

وجہ سے خلافت بنی عباس کو ملی ہے۔ اگر آپ حضرات راضی ہوں تو میں حالات کو پلٹ دیتا ہوں یعنی وہ خلافت آپ کو دے دیتا ہوں۔

امام علیہ السلام اور عبداللہ محض کا ردعمل

قاصد وہ خط سب سے پہلے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں لے آیا۔ رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ اس کے بعد عبداللہ محض کو ابوسلمہ کا خط پہنچایا گیا۔ جب اس نے یہ خط حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں پیش کیا تو عرض کی مولا یہ خط آپ کے ماننے والے ابوسلمہ کا ہے۔ حضرت نے فرمایا ابوسلمہ ہمارا شیعہ نہیں ہے۔ قاصد نے کہا آپ مجھے ہر صورت میں جواب سے نوازیں۔ آپ نے چراغ منگوایا آپ نے ابوسلمہ کا خط نہ پڑھا اور اس کے سامنے وہ خط پھاڑ کر جلا دیا اور فرمایا اپنے دوست (ابوسلمہ) سے کہنا کہ اس کا جواب یہی ہے اس کے بعد حضرت نے یہ شعر پڑھا۔

ایا موقدا نارا لغیرک ضوءہا
یا حاطبافی غیر حبلک تحطب

"یعنی آگ روشن کرنے والے اور، اس کی روشنی سے دوسرے مستفید ہوں۔ اے وہ کہ جو صحرا میں لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے اور تو خیال کرتا ہے کہ یہ تو اپنی رسی میں ڈالی ہیں تجھے یہ خبر نہیں ہے تو نے جتنی بھی لکڑیاں جمع کی ہیں اس کو تیرے دشمن اٹھا کر لے جائیں گے۔"

اس شعر سے حضرت کا مقصد یہ تھا کہ ایک شخص محنت کرتا ہے لیکن اس کی محنت سے استفادہ دوسرے لوگ کرتے ہیں گویا آپ کہہ رہے تھے کہ ابوسلمہ بھی کتنا بد بخت شخص ہے کہ اس نے حکومت کی تشکیل دینے کیلئے بہت زیادہ محنت کی ہے لیکن اس

سے فائدہ دوسروں نے اٹھایا ہے یا اس شعر کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم خلافت کے لئے محنت کرتے ہیں اور وہ نا اہل ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

کتنے افسوس اور دکھ کی بات ہے حضرت نے خط کو جلا دیا اور اس قاصد کو جواب نہ دیا ابوسلمہ کا قاصد وہاں سے اٹھا اور عبداللہ محض کے پاس آیا اور ان کو ابوسلمہ کا خط دیا۔ عبداللہ خط کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے۔ مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ عبداللہ صبح ہوتے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے در دولت پر آئے۔ امام علیہ السلام نے ان کا احترام کیا، حضرت جانتے تھے کہ عبداللہ کے آنے کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا لگتا ہے کہ آپ کوئی نئی خبر لے کر آئے ہیں۔ عبداللہ نے عرض کی جی ہاں ایسی خبر کہ جس کی تعریف و توصیف بیان نہ کی جا سکے۔ (نعم ہو اجل من ان یوصف) یہ خط ابوسلمہ نے مجھے بھیجا ہے انہوں نے اس خط میں تحریر کیا ہے کہ خراسان کے تمام شیعہ اس بات پر مکمل طور پر تیار ہیں کہ خلافت و ولایت ہمارے سپرد کر دیں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ ان کی یہ پیشکش قبول کر لوں۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا:

"ومتی کان اهل خراسان شیعة لك؟"

خراسان والے آپ کے شیعہ کب بنے ہیں؟"

انت بعثت ابا مسلم الی خراسان؟"

کیا آپ نے ابو مسلم کو خراسان بھیجا ہے؟"

آپ نے خراسان والوں سے کہا ہے کہ وہ سیاہ لباس پہنیں اور ماتمی لباس کو اپنا شعار بنائیں۔ کیا یہ خراسان سے آئے ہیں یا لائے گئے ہیں؟ تم تو ایک آدمی کو بھی نہیں پہچانتے؟ امام علیہ السلام کی باتیں سن کر عبداللہ ناراض ہو گئے۔ انسان جب کوئی چیز

پسند کرے اور اس کی خوشخبری سننے کے بعد کوئی اور بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ گویا یہ انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بحث کرنی شروع کر دی اور حضرت سے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں:

"انما یرید القوم ابنی محمدا لانه مھدی ھذہ الامة"

یہ میرے بیٹے محمد کو خلافت دینا چاہتے ہیں آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اس امت کا امام مہدی آپ کا بیٹا محمد نہیں ہے اگر اس نے قیام کیا تو قتل کیا جائے گا۔ یہ سن کر عبداللہ اظہار ناراضگی کرتے ہوئے بولا آپ خواہ مخواہ ہماری مخالفت کر رہے ہیں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا بخدا ہم تمہاری خیر خواہی اور بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ آپ کا مقصد کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بخدا ابوسلمہ نے بالکل اسی طرح کا خط ہماری طرف بھی روانہ کیا ہے لیکن ہم نے پڑھنے کی بجائے اس کو آگ میں جلا دیا۔ عبداللہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت سیاسی فضا کس قدر مکدر تھی، بنی عباس کی تحریک کامیاب ہوتی ہے؟ ابو مسلم اس وقت خاصا فعال ہوتا ہے۔ اور وہ ابوسلمہ جیسے انقلابی شخص کو قتل کرا دیتا ہے۔ سفاح بھی اس کی حمایت کرنے لگ جاتا ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ابوسلمہ کا قاصد ابھی مدینہ سے کوفہ نہ پہنچا تھا کہ ابوسلمہ قتل ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عبداللہ محض کا جواب ابوسلمہ کے ہاتھوں تک نہ پہنچ سکا۔

ایک تحقیق

اس واقعہ کو جس خوبی کے ساتھ مسعودی نے لکھا ہے اتنا اور کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ میرے نزدیک ابوسلمہ کا مسئلہ بہت واضح ہے کہ وہ شخص سیاستدان تھا۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شیعوں میں ہرگز نہ تھا۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک

مرتبہ آل عباس کیلئے کام کرتا ہے اور دوسری مرتبہ وہ اپنی پالیسی بدل لیتا ہے۔ دراصل عوام کی اکثریت یہ نہیں چاہتی تھی کہ خلافت خاندان رسالت سے باہر کسی دوسرے شخص کے پاس جائے۔ آل ابی طالب میں دو شخصیات اہم شمار کی جاتی تھیں ایک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور دوسرے جناب عبداللہ محض، ابوسلمہ ان دونوں شخصیات کے ساتھ دینداری اور خلوص کی وجہ سے یہ کام نہیں کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ خلافت بدلنے سے اس کے ذاتی مفادات محفوظ رہیں۔ ابھی اس کو امام جعفر صادق علیہ السلام اور عبداللہ محض کی طرف سے جواب موصول نہ ہوا تھا کہ ابوسلمہ قتل ہو گیا۔ جب میں یہ بات کرتے ہوئے لوگوں کو سنتا ہوں تو مجھے حیرانگی ہوتی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابوسلمہ کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا اور اس کی دعوت قبول کیوں نہیں کی تھی؟ اسکا جواب بھی صاف ظاہر ہے کہ یہاں پر بھی حالات سازگار نہ تھے۔

صورت حال نہ روحانی لحاظ سے اچھی تھی اور نہ ظاہری لحاظ سے بہتر تھی بلکہ امام علیہ السلام نے جو بھی اقدامات کیے وہ حقیقت پر مبنی تھے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے شروع ہی سے بنی عباس کی کسی قسم کی حمایت نہیں کی۔ دراصل آپ نہ امویوں کے حق میں تھے اور نہ عباسیوں کے حق میں۔ یہ دو خاندان اور موروثی حکمران ذاتی مفاد کے علاوہ کوئی سوچ نہ رکھتے تھے۔ ہم نے کتاب الفرج اصفہانی سے استفادہ کیا۔ اس سلسلے میں جتنی ابوالفرج نے تفصیل لکھی ہے اتنا اور کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ ابوالفرج اموی مورخ تھے۔ اور سنی المذہب تھے ان کو اصفہان میں سکونت رکھنے کی وجہ سے اصفہانی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ اصفہانی نہ تھے بلکہ اموی تھے اگرچہ یہ اموی مورخ تھے لیکن انہوں نے تاریخ نویسی میں اعتدال قائم رکھا اس لئے جناب شیخ مفید (رح) نے اپنی کتاب ارشاد میں ابوالفرج سے روایات نقل کی ہیں۔

ہاشمی رہنماؤں کی خفیہ میٹنگ دراصل بات یہ ہے کہ شروع میں یہ طے پایا تھا

کہ امویوں کے خلاف تحریک شروع کی جائے۔ بنی ہاشم کے سرکردہ لیڈر ابواء مقام پر جمع ہو گئے تھے۔ یہ مقام مکہ و مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ (ابواء یہ ایک تاریخ جگہ ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں پیغمبر اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا تھا۔) حضور ﷺ پاک کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ تھے بی بی اپنے اس عظیم صاجزادے کو اپنے ہمراہ لائی تھیں۔ حضرت آمنہ کے رشتہ دار مدینہ میں آباد تھے۔ اس لئے حضور پاک مدینہ والوں کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتے تھے۔ بی بی مدینہ سے ہو کر واپس مکہ جارہی تھیں کہ راستہ میں مریض ہوئیں اور وہیں پر انتقال فرمایا اس جگہ کو مورخین نے ابواء کے نام سے یاد کیا ہے۔ حضور پاک ﷺ اپنی ماں کی کنیز خاص بی بی ام ایمن کے ساتھ مدینہ چلے گئے اور آپ کی والدہ ماجدہ کو ابواء ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ نے عالم غربت میں اپنی عظیم ماں کی المناک رحلت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عمر بھر آپ اس غم کو نہ بھلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ۵۳ سال کی عمر میں مدینہ واپس لوٹ آئے اور اپنی زندگی کے آخری دس سال مدینہ ہی میں گزارے۔ آپ ایک موقعہ پر اثناء سفر میں ابواء نامی جگہ سے گزرے تو آپ چند لمحوں کیلئے اپنے صحابہ سے جدا ہو گئے اور ایک خاص جگہ پر رک گئے۔ دعا پڑھی اس کے بعد زاروقطار رونے لگے۔ صحابہ کرام نے تعجب کیا کہ حضور پاک ﷺ رونے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میری والدہ ماجدہ کی قبر اطہر ہے۔ آج سے پچاس سال قبل جب میں پانچ سالہ بچہ تھا تو یہیں پر والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تھا۔ آپ پچاس سالوں کے بعد اس مقام پر گئے اور دعا پڑھی اور اس کے بعد اپنی انتہائی عزیز ترین ماں کی یاد میں بہت ہی زیادہ روئے"۔ چنانچہ ابواء کے مقام پر ہونے والی خفیہ میٹنگ میں اولاد امام حسن علیہ السلام عبداللہ محض اور آپ کے دونوں صاجزادے محمد و ابراہیم موجود تھے۔ اسی طرح بنی عباس کی نمائندگی کرتے ہوئے ابراہیم امام، ابوالعباس سفاح، ابوجعفر منصور اور ان

کے چند بزرگوں نے شرکت کی۔ اس وقت عبداللہ محض نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اے بنی ہاشم! اس وقت لوگوں کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور عوام کی آپ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں پر اکٹھے ہونے کا موقعہ بخشا ہے لہذا سب مل جل کر اس نوجوان (عبداللہ محض کے بیٹے) کی بیعت کریں۔ ان کو اپنی تحریک کا قائد منتخب کریں۔ اور امویوں کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگ کا آغاز کریں۔ یہ واقعہ ابوسلمہ کے واقعات سے پہلے کا ہے۔ تقریباً انقلاب خراسان سے بارہ سال قبل۔ اس وقت اولاد امام حسن علیہ السلام اور بنوعباس کی مشترکہ خواہش تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو کر امویوں کا مقابلہ کریں۔

محمد نفس زکیہ کی بیعت

بنی عباس کا شروع سے یہی پروگرام تھا کہ وہ آل علی علیہ السلام میں ایسے نوجوان کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں کہ جو لوگوں میں مقبول ہو اور لوگ اس کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہوں۔ جب ان کی تحریک کامیاب ہو جائے گی تو اس نوجوان کو درمیان میں سے ہٹا دیا جائے گا۔ اس کام کیلئے انہوں نے محمد نفس زکیہ کو منتخب کیا۔ محمد جناب عبداللہ محض کے صاحبزادے تھے۔ عبد اللہ بہت ہی متقی اور پرہیز گار اور انتہائی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا بیٹا محمد کردار و گفتار اور شکل وصورت میں ہو بہو اپنے باپ کی تصویر تھا۔ اسلامی روایات میں ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو اولاد پیغمبر ﷺ میں سے ایک نوجوان ظاہر ہوتا ہے اور اپنے جد امجد کی طرح اسی کا نام بھی محمد ہوگا اسی طرح اسلامی تحریکیں چلتی رہیں گی اور اولاد زہرا علیہا السلام میں سے ایک سیدزادہ انقلابی جدوجہد کی قیادت کرتا رہے گا۔ اولاد امام حسن علیہ السلام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ امت کا مہدی یہی محمد ہے۔ بنوعباس کے نزدیک بھی یہی محمد مہدی

کے طور پر نمودار ہوئے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے سازش کر کے ان کو مہدی وقت مان لیا ہو؟

بہر حال ابو الفرج نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ محض نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا ہمیں متحد ہو کر ایک ایسے نوجوان کی قیادت میں کام شروع کر دینا چاہیے کہ جو اس مظلوم ملت کو ظالموں کے شکنجوں سے نجات دے سکے۔ اسکے بعد بولے ایہا الناس اے لوگو! میری بات غور سے سنو ان ابنی ہذا ہو المہدی کہ میرا بیٹا محمد ہی مہدی دوراں ہے۔ آپ سب مل کر ان کی بیعت کریں۔ اس اثناء میں منصور بولا کہ مہدی کے عنوان سے نہیں البتہ یہ نوجوان موجودہ دور میں قیادت کے فرائض احسن طریقے سے نبھا سکتا ہے۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں ہم سب کو اس نوجوان کی بیعت کرنی چاہیے۔ میٹنگ کے تمام شرکاء نے ایک زبان ہو کر اس کی تصدیق کی اور ایک ایک کر کے انہوں نے محمد کی بیعت کی۔ اس کے بعد انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ آپ بھی تشریف لائیں۔ جب حضرت تشریف فرما ہوئے سب نے حضرت کا استقبال کیا۔ عبداللہ محض جو صدر مجلس تھے نے اپنے پہلو میں حضرت کو جگہ دی۔ اس کے بعد انہوں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں رپورٹ پیش کی اور کہا جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ملکی و سیاسی حالات مخدوش ہیں لہذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اٹھے اور امت و ملت کی قیادت کرے۔ اس میٹنگ کے تمام شرکاء نے میرے بیٹے محمد کی بیعت کی ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مہدی دوراں یہی محمد ہی ہیں۔ لہذا آپ ان کی بیعت کریں۔ **فقال جعفر لا تفعلوا** امام علیہ السلام نے فرمایا نہیں تم ایسا نہ کرو:

"فان ہذا الامر ثم یات بعد ان کنت تری ان ابنك ہذا ہو

المہدی فلیس بہ ولا ہذا اوانہ"

رہی بات مہدی علیہ السلام کے ظہور کی تو یہ وقت ظہور نہیں ہے۔ اے عبداللہ اگر تم خیال کرتے ہو کہ تمہارا یہ بیٹا محمد مہدی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو، تمہارا بیٹا ہر گز مہدی نہیں ہے اس وقت مہدی علیہ السلام کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کی آمد اور ظہور کا وقت ہوا ہے۔"

وان کنت انما یرید ان تخرجه غضبا لله ولیامر بالمعروف وینه عن المنکر فانا والله لا ندعك فانت شیخنا ونبایع ابنك فی الامر "

حضرت نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے فرمایا اگر تم مہدی کے نام پر بیعت لے رہے ہو تو میں ہرگز بیعت نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ سراسر جھوٹ ہے یہ مہدی نہیں ہے اور نہ ہی مہدی علیہ السلام کے ظہور کا وقت ہوا ہے لیکن اگر آپ نیکی کے فروغ اور برائیوں اور ظلم کے خاتمے کے لئے جہاد کریں گے تو ہم آپ لوگوں کا ہر طرح سے ساتھ دیں گے۔"

امام علیہ السلام کے اس فرمان سے آپ کا موقف کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ آپ نے نیکیوں کی ترویج اور برائیوں کے خاتمہ کے لئے ساتھ دینے کا وعدہ تو کیا لیکن آپ نے ان کی غلط پالیسیوں کی مخالفت کر دی کہ یہ محمد مہدی نہیں ہے۔ جب آپ نے بیعت کا انکار کیا تو عبداللہ ناراض ہو گئے۔ جب آپ نے عبداللہ کی ناراضگی کو دیکھا تو فرمایا دیکھو عبداللہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا بیٹا محمد مہدی نہیں ہیں ہم اہل بیتؑ کے نزدیک یہ ایک ایسا راز ہے کہ جس کو ہم ہی جانتے ہیں ہمارے سوا کوئی اور نہیں جانتا کہ وقت کا امام کون ہے اور مہدی علیہ السلام کون ہوگا؟ یاد رکھو تمہارا یہ بیٹا بہت جلد قتل کر دیا

جائے گا۔ ابوالفرج نے لکھا ہے کہ عبداللہ سخت ناراض ہوئے اور کہا خیر آپ نے جو کہنا تھا کہہ دیا لیکن ہمارا نظریہ یہی ہے کہ محمد مہدی وقت ہے، آپ حسد اور خاندانی رقابت کے باعث اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔

"فقال واللہ ماذاك يحملني ولكن هذا واخوته وابناءهم دونكم وضرب يده ظهر ابي العباس"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنا دست مبارک ابوالعباس کی پشت پر مارتے ہوئے فرمایا یہ بھائی مسند خلافت پر فائز ہو جائیں گے اور آپ اور آپ کے بیٹے محروم رہیں گے۔"

اس کے بعد آپ نے عبداللہ حسن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

"ما هي اليك ولا الى ابنيك"

تم اور تمہارے بیٹے خلافت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

ان کو قتل ہونے سے بچائیے۔ بنو عباس آپ کو خلافت تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ اور تمہارے دونوں بیٹے قتل کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد امام علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنا ایک ہاتھ عبدالعزیز عمران زہری کے کندھے پر رکھتے ہوئے اس سے کہا:

"ارایت صاحب الرداء الاخضر؟"

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ جس نے سبز قبا پہنی ہوئی تھی؟"

(آپ کی اس سے مراد ابوجعفر منصور تھی) وہ بولا نعم جی ہاں آپ نے فرمایا خدا کی قسم ہم جانتے ہیں کہ یہی شخص مستقبل قریب میں عبداللہ کے بیٹوں کو قتل کر دے گا۔

یہ سن کر عبدالعزیز سخت متعجب ہوا اور اپنے آپ سے کہنے لگا یہ لوگ آج تو اس کی بیعت کر رہے ہیں اور کل اسے قتل کر دیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں عبدالعزیز ایسا ہی ہوگا عبدالعزیز نے کہا میرے دل میں تھوڑا سا شک گزرا ہو سکتا ہے امام علیہ السلام نے حسد وغیرہ کی وجہ سے ایسا کہا ہو لیکن خدا کی قسم میں نے اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیا کہ ابوجعفر منصور نے عبداللہ کے دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام محمد سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ابوالفرج کے بقول

"كان جعفر بن محمد اذا راى محمد بن عبدالله بن الحسن تغرغرت عيناه"

کہ امام علیہ السلام کی نگاہ مبارک جب محمد پر پڑتی تو آپ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو چھلک پڑتے اور فرمایا کرتے:

"بنفسي هو ان الناس فيقولون فيه انه لمقتول ليس هذا في كتاب علي من خلفاء هذه الامة"

میری جان قربان ہو اس پر لوگ جو اس کے بارے میں مہدی ہونے کے قائل ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ نوجوان قتل کیا جائے گا ہمارے پاس حضرت علی علیہ السلام کی ایک کتاب موجود ہے اس میں محمد کا نام خلفاء میں شامل نہیں ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تحریک کا آغاز ہی مہدویت کے نام پر ہوا ہے لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کی سخت مخالفت کی اور فرمایا اگر یہ تحریک نیکیوں کے فروغ اور برائیوں کے خاتمہ کے لئے ہے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں گے لیکن ہم محمد کو مہدی کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتے، رہی بات بنو عباس کی تو ان کا مطمع نظر سیاسی و حکومتی مفادات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت کی چند خصوصیات یہاں پر ہم جس لازمی نکتے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور امامت اسلامی خدمات کے حوالے سے بے نظیر اور بہترین دور ہے۔ آپ کے دور میں مختلف قسم کی تحریکوں نے جنم لیا، بے شمار انقلابات رونما ہوئے۔ امام علیہ السلام کے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا انتقال ۱۱۴ کو ہوا۔ آپ اس وقت امام وقت مقرر ہوئے اور ۱۴۸ تک زندہ رہے۔ ظہور اسلام سے لیکر اب تک دو تین نسلیں حلقہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ سیاسی وتمدنی لحاظ سے بے تحاشا ترقی ہوئی۔ اور کچھ ایسی جماعتیں بھی وجود میں آئیں جو خدا کی منکر تھیں۔ زندیق اس دور میں رونما ہوئے یہ لوگ خدا، دین اور پیغمبر کے مخالف تھے۔ بنی عباس کی طرف سے ان بے دین عناصر کو ہر لحاظ سے آزادی حاصل تھی۔ صوفیاء بھی اسی دور میں ظاہر ہوئے اور کچھ ایسے فقہا بھی پیدا ہوئے کہ جو فقہ کو قیاس کی طرف لے گئے۔ اس دور میں مختلف نظریات رکھنے والے لوگ، جماعتیں پیدا ہوئیں۔ اس نوع کی تبدیلی اور جدت وندرت پہلے ادوار میں نہ تھی۔

امام حسین علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانوں کا زمین وآسمان کا فرق ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے دور میں بہت زیادہ گھٹن تھی اور مشکل ترین دور تھا اس لئے امام عالی مقام نے اپنے دور امامت میں حدیث کے پانچ چھ جملے بیان فرمائے اس کے علاوہ کوئی حدیث نظر نہیں آتی، لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور امام تعلیمی وتربیتی حوالے سے بہترین دور تھا۔ آپ نے فرصت کے ان لمحوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت کم مدت میں چار ہزار فضلاء تیار کیے۔ لہذا اگر ہم فرض کریں (جو کہ غلط ہے) کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو وہی حالات پیش آتے جو امام حسین علیہ السلام کو پیش آئے تھے تو پھر بھی امام جعفر صادق علیہ السلام علمی کارنامے انجام دیتے؟ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ آئمہ طاہرین کی حیات طیبہ کا انداز ایک جیسا ہوتا ہے اور آپ کی شہادت وہی رنگ

لاتی جو کہ امام حسین علیہ السلام کی لائی ہے۔ اگر چہ آپ ایک وقت درجہ شہادت پر فائز بھی ہوئے لیکن آپ کو قدرت نے خوب موقعہ فراہم کیا کہ آپ نے علمی و دینی لحاظ سے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیئے۔ آج امام جعفر صادق علیہ السلام کا نام پوری دنیا میں ایک بہت بڑے مصلح کے طور پر مانا جاتا ہے۔ امام علیہ السلام کے بارے میں اگلی نشست میں کچھ مزید باتیں عرض کروگا۔ ان شاء اللہ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اور مسئلہ خلافت

ہم نے گزشتہ تقریر میں عرض کیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں مسئلہ خلافت بھرپور طریقے سے سامنے آیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے دور میں حالات نے کچھ اس طرح کروٹ لی کہ طالبان حکومت داعیان خلافت ایک بار پھر پورے جوش وخروش کے ساتھ میدان عمل میں آ گئے لیکن مصلحت وقت کے تحت امام جعفر صادق علیہ السلام نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آپ کے دور امامت میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ امویوں کی حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ ہوا۔ پھر ابوسلمہ خلال اور ابومسلم جیسے انقلابی لوگ پیدا ہوئے۔ ابوسلمہ کو وزیر آل محمد علیہ السلام اور ابومسلم کو امیر آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ یہی نوجوان امویوں کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنے اگرچہ انہوں نے عباسیوں کو اقتدار حکومت سونپنے میں بھرپور کردار ادا کیا تاہم ابوسلمہ ایسا نوجوان ہے کہ جو آخر میں اس چیز کی خواہش رکھتا تھا کہ اقتدار آل علی علیہ السلام کو منتقل کیا جائے۔ انہوں نے اسی مقصد کی تکمیل کیلئے ایک خط امام جعفر صادق علیہ السلام اور عبداللہ محض کے نام بھی ارسال کیا تھا ان دونوں شخصیات میں عبداللہ حکومت ملنے پر خوش اور آمادہ تھے لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابوسلمہ کی اس پیش کش کو ذرہ بھر اہمیت نہ دی۔ یہاں تک آپ نے اس کے خط کو بھی نہ پڑھا جب آپ کی خدمت میں چراغ لایا گیا تو امام علیہ السلام نے اس خط کو نہ فقط پھاڑ دیا بلکہ اسے جلا بھی دیا اور فرمایا اس خط کا جواب یہی ہے اس سے متعلق ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے سیاسی وحکومتی امور میں دلچسپی لینے اور ان میں مداخلت کرنے کی بجائے گوشہ نشینی کو ترجیح دی اور آپ اقتدار کو سنبھالنے کی ذرا

بھر خواہش نہ رکھتے تھے اور نہ ہی اس کے لئے کسی قسم کی کوشش کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام اگر کوشش کرتے تو اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ اس کے باوجود آپ خاموش کیوں رہے؟ اس عدم دلچسپی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ جبکہ فضا بھی امام کے حق میں تھی۔ بالفرض اگر اس مقصد کے لئے آپ شہید بھی ہو جاتے تو شہادت بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے، ایک بار پھر ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں کچھ روشنی ڈالتے ہیں تاکہ حقیقت پوری طرح سے روشن ہو جائے۔ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ اگر امام حسین علیہ السلام اس دور میں ہوتے تو آپ کا انداز زندگی بالکل امام جعفر صادق علیہ السلام اور دیگر آئمہ طاہرین علیہ السلام جیسا ہوتا چونکہ امام حسین علیہ السلام اور دیگر اماموں کے دور ہائے امامت میں فرق تھا اس لئے ہر امام نے مصلحت وحکمت عملی اپناتے ہوئے امن وآشتی کا راستہ اختیار کیا۔ ہماری گفتگو کا محور یہ نہیں ہے کہ امام علیہ السلام نے اقتدار کیوں نہیں قبول کیا؟ بلکہ بات یہ ہے کہ آپ چپ کیوں رہے اور میدان جنگ میں آ کر اپنی جان جان آفرین کے حوالے کیوں نہیں کی؟

امام حسین علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام کے ادوار میں باہمی فرق

ان دو اماموں کا آپس میں ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت سال ۶۱ ہجری کو ہوئی اور امام صادق علیہ السلام کی شہادت ۱۴۸ کو واقع ہوئی گویا ان دو اماموں کی شہادتیں ۸۷ سال ایک دوسرے سے فرق رکھتی ہیں۔ اس مدت میں زمانہ بہت بدلا، حالات نے کروٹ لی اور دنیائے اسلام میں گونا گوں تبدیلیاں ہوئیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دور میں صرف ایک مسئلہ خلافت تھا کہ جس پر اختلاف ہوا دوسرے لفظوں میں ہر چیز خلافت میں سموئی ہوئی تھی، اور خلافت ہی کو معیار زندگی سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت اختلاف کا مقصد اور بحث کا ماحصل یہ تھا کہ کس کو "امیر امت" متعین کیا جائے اور کس کو نہ کیا جائے۔ اسی وجہ سے خلافت کا تصور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ امیر شام سیاسی لحاظ سے بہت ہی طاقتور اور ظالم شخص تھا۔ اس کے دور حکومت میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ لوگ حکومت وقت کے خلاف ایک جملہ تک نہ کہہ سکتے تھے۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت میں کوئی حدیث بیان کرنا چاہتا تو وہ اپنے اندر خوف محسوس کرتا تھا اور اس کو دھڑکا سا لگا رہتا کہ کہیں حکومت وقت کو پتہ نہ چل جائے۔ نماز جمعہ کے اجتماعات میں حضرت علی علیہ السلام پر کھلے عام تبرا کیا جاتا تھا۔ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی موجودگی میں منبر پر حضرت امیر علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) کھلے عام برا بھلا کہا جاتا تھا۔ جب ہم امام حسین علیہ السلام کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کا موسم کس قدر پتھریلا اور

سخت تھا؟

کیسا عجیب دور تھا کہ امام حسین علیہ السلام جیسے امام سے ایک حدیث، ایک جملہ، ایک مکالمہ ایک خطبہ اور ایک تقریر اور ایک ملاقات کا ذکر نہیں ہے۔ عجیب قسم کی گھٹن تھی۔ لوگوں کو آپ سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ آپ نے پچاس سالوں میں کتنی تلخیاں دیکھیں۔ کتنی پابندیاں برداشت کیں۔ یہ صرف امام حسین علیہ السلام ہی جانتے ہیں یہاں تک آپ سے تین جملے بھی حدیث کے نقل نہیں کیے گئے۔ آپ ہر لحاظ سے مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ دور بھی گزر گیا جانے والے چلے گئے اور آنے والے آ گئے بنی امیہ کی حکومت ختم ہوئی اور بنو عباس کی حکومت شروع ہوئی اس وقت لوگوں میں علمی و فکری لحاظ سے کافی تبدیلی ہو چکی تھی۔ لوگ فکری لحاظ سے آزادی محسوس کرتے تھے۔ اس دور میں جس تیزی سے علمی و فکری ترقی ہوئی اس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت پر وسیع پیمانے پر کام ہونے لگا مثال کے طور پر علم قرات، علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور دیگر ادبی سرگرمیاں عروج پر ہونے لگیں یہاں تک کہ طب، فلسفہ، نجوم اور ریاضی وغیرہ جیسے علوم منظر عام پر آنے لگے۔

یہ سب کچھ تاریخ میں موجود ہے کہ حالات کا رخ بدلنے سے لوگوں میں علمی وفکری شعور پیدا ہوا۔ باصلاحیت افراد کو اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقعہ ملا۔ یہ علمی فضا اور تعلیمی ماحول امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانوں سے قبل وجود تک نہ رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ صرف حالات بدلنے سے ہوا کہ لوگ اچانک علم و عمل، فکر و نظر کی باتیں سننے لگے اور پھر کیا ہوا کہ چہار سو علم کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ اب اگر بنو عباس پابندی عائد کرنا بھی چاہتے تو ان کے بس سے باہر تھا۔ کیونکہ عربوں کے علاوہ دوسری قومیں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں۔ ان قوموں میں ایرانی غیر معمولی حد تک روشن فکر تھے۔ ان میں جوش و جذبہ بھی تھا اور علمی صلاحیت بھی۔ مصری اور شامی لوگ بھی

فکری اعتبار سے خاصے زرخیز تھے۔ ان علاقوں میں دنیا کے مختلف افراد آکر آباد ہوئے۔ پھر دنیا کے لوگوں کی آمدورفت نے اس خطے کو علم وادب کا گہوارا بنادیا۔ مختلف قومیں، مختلف نظریات اور پھر بحث مباحثوں سے فضا میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی۔ یہاں پر اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ دوسری طرف عرب قرآن مجید میں کچھ زیادہ غور وخوض نہ کرتے تھے، لیکن دوسری قوموں میں قرآنی تعلیمات حاصل کرنے کے بارے میں بہت زیادہ جذبہ کارفرما تھا۔ اس دور میں قرآن مجید کے ترجمہ، تفسیر اور مفاہیم پر خاصہ کام ہوا اور لوگ قرآن مجید کو بنیادی حیثیت دے کر بات کرتے تھے۔

نظریات کی جنگ

اچانک پھر کیا ہوا کہ عقائد ونظریات کا بازار گرم ہو گیا، سب سے پہلے تو تفسیر قرآن، قرات اور آیات قرانی پر بحث ہونے لگی۔ ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ جو لوگوں کو علم قرات، اور الفاظ، حروف کی صحیح ادائیگی کے بارے میں تعلیم دینے لگی، اس وقت قرآن مجید کی اشاعت وطباعت ایسی نہ تھی کہ جیسا کہ ہمارے دور میں ہے۔ ان میں سے ایک شخص کہتا تھا میں قرأت کرتا ہوں اور یہ روایت فلاں بن فلاں صحابی سے نقل کرتا ہوں اور ان کی اکثریت حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتی تھی۔ دوسرے افراد مختلف شخصیات سے روایت کرتے اسی طرح بحثوں اور مذاکروں کا سلسلہ عروج تک جا پہنچا۔ یہ لوگ مساجد میں جا کر لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے۔ عربوں کی نسبت غیر عرب زیادہ شوق وذوق سے شرکت کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عجمی لوگ قرآن مجید کو پڑھنے اور سمجھنے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ایک قرات کے استاد مسجد میں آکر

لوگوں کو درس قرآن دیتے اور ان کے اردگرد لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا۔ اتفاق سے قرات میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا پھر قرآن مجید کے معانی پر اختلاف پیدا ہو گیا، کوئی کچھ معنی کرتا اور کوئی کچھ۔ اسی طرح احادیث کے بارے میں بھی مختلف آراء تھیں۔ حافظ احادیث کو بہت زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ مساجد ومحافل میں بڑے فخر وانبساط سے احادیث نقل کرتا اور لوگوں کو نئے اسلوب کے ساتھ حدیثیں بیان کرتا۔ نقل احادیث کے مراحل بھی بیان کرتا کہ یہ حدیث میں نے فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے اور فلاں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے پھر اس کا معنی و مفہوم یہ ہے۔

ان میں قابل احترام طبقہ فقہاء کا تھا لوگ ان سے فقہی مسائل پوچھتے تھے جیسا کہ اب بھی لوگ علماء سے شرعی وفقہی مسائل دریافت کرتے ہیں۔ فقہاء کی ایک کثیر تعداد مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ لوگوں کو آسان طریقے سے بتایا جاتا تھا کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام یہ چیز پاک ہے اور یہ نجس یہ کاروبار صحیح ہے اور یہ ناجائز وغیرہ وغیرہ، مدینہ بہت بڑا علمی مرکز تھا اور دوسرا بڑا مرکز کوفہ میں قائم تھا۔ جناب ابوحنیفہ کوفہ میں تھے بصرہ بھی علمی لحاظ سے کافی اچھی شہرت کا حامل تھا۔ اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں اندلس فتح ہوا تو یہاں پر بھی علمی مرکز قائم ہو گیا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہر اسلامی شہر علم وعمل کا مرکز کہلاتا تھا کہا جاتا تھا کہ فلاں فقیہہ کا یہ نظریہ ہے اور فلاں فقیہہ یہ فرماتے ہیں مختلف مکاتب فکر کی موجودگی میں اختلاف رائے کا پیدا ہونا ضروری امر تھا۔ چنانچہ فقہی میدان میں بھی عقائد کی جنگ چھڑ گئی اور یہ روز بروز زور پکڑتی گئی۔ ان تمام اختلافات سے بڑھ کر اختلاف "علم کلام" کا تھا۔

پہلی صدی ہی میں متکلم حضرات کی آمد شروع ہو گئی جیسا کہ ہم امام جعفر

صادق علیہ السلام کے دور میں دیکھتے ہیں کہ "متکلمین" آپس میں بحث مباحثہ کرتے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعض شاگرد علم کلام میں خاص مہارت رکھتے تھے اور اعتراض کرنے والوں کو بڑے شائستہ طریقے سے جواب دیتے تھے۔ یہ لوگ خدا، صفات خدا اور قرآن مجید کی ان آیات سے متعلق بحث وتمحیص کرتے جو خدا کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ خدا کی فلاں صفت عین ذات ہے یا نہیں، کیا وہ حادث ہے یا قدیم؟ نبوت اور وحی کے بارے میں بحث کی جاتی تھی، شیطان کو بھی بحث میں لایا جاتا ہے کہ یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے اس کا کام کیا ہے اور اس کے شر سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ پھر ایمان اور عمل پر روشنی ڈالی جاتی قضا وقدر، جبر واختیار پر گفتگو ہوتی۔ غرض کہ علم کلام کے ماہرین کے مابین نوک جھونک ہوتی رہتی اور مباحثوں کا یہ طویل سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور آج تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گا لیکن بحث کے وقت انسان انتہا پسندانہ رویے کو ترک کر کے صلح وآشتی اور پرامن رویے کو اپنے سامنے رکھے۔ ان بحثوں کا نتیجہ تھا کہ ایک خطرناک ترین گروہ پیدا ہو گیا۔ ان کو آپ زندیق، لامذہب کہہ سکتے ہیں۔ یہ لوگ خدا اور ادیان کے قائل نہ تھے۔ ان کو ہر لحاظ سے مکمل آزادی تھی، یہ مکہ ومدینہ، مسجد الحرام یہاں تک مسجد الحرام اور مسجد النبی میں بیٹھ کر اپنے عقائد کی ترویج کرتے تھے۔

اگر چہ وہ ہمارے نزدیک ایک بے دین کی سی حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ پڑھے لکھے ضرور تھے، ان کے سینوں میں علم اور ان کے ذہنوں میں فکر تھی، جو انہیں کچھ سوچنے اور بولنے پر مجبور کر رہی تھی یہ اور بات ہے کہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے۔ ان میں کچھ سریانی زبان بولتے تھے اور کچھ یونانی زبان جانتے تھے، کچھ ایرانی تھے کہ فارسی بولتے تھے۔ کچھ ہندی زبان جانتے تھے۔ سرزمین ہند سے کافی زندیق منگوائے گئے تھے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ زندیقیوں کا وجود کہاں سے

شروع ہوا اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اس دور کی ایک اور بات کہ لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ صوفیوں اور خشک مقدس مولویوں کے روپ میں سامنے آ گئے۔ یہ صوفی حضرات بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں وارد ہوئے۔ انہوں نے بہت جلد اپنا ایک مستقل اور الگ گروہ بنا لیا۔ یہ کھلے عام تبلیغ کرتے تھے۔

یہ لوگ اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کرتے بلکہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ اصل اسلام وہی ہے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں۔ ان خشک مقدس مولویوں نے لوگوں میں عجیب قسم کا نظریہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کا ظاہری صالحانہ، عابدانہ اور زاہدانہ انداز اختیار کرنا زبردست کشش کا باعث بنا اور یہ خالص اور حقیقی دین اسلام کے لیے زبردست خطرے کا باعث تھا خوارج بھی اسی نظریہ کی پیداوار ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام
اور مختلف مکاتب فکر

ہم دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اتنی بڑی مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود مختلف فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی اسلامی طریقے سے تربیت کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔قرآت اور تفسیر میں امام علیہ السلام نے انتہائی قابل ترین شاگرد تیار کیے جو لوگوں کو قرآن مجید کی صحیح طریقے سے تعلیم دیتے اور ان کو صحیح تفسیر سے متعارف کراتے، جہاں کہیں کسی قسم کی غلطی دیکھتے فوراً پکار اٹھتے اور بروقت اصلاح کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر ایسے ہونہار طلب علم بھی میدان میں آئے جو علم حدیث میں پوری طرح سے مہارت رکھتے۔ ناسمجھ لوگوں کو بتایا جاتا کہ حدیث صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔اس حدیث کا سلسلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ حدیث من گھڑت ہے۔

فقہی مسائل کے حل اور لوگوں کی شرعی احکام میں تربیت کے لیے آپ کے لائق ترین شاگردوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ جو لوگ فقہ سے نا آشنائی رکھتے یہ نوجوان طلبہ قریہ قریہ جا کر لوگوں کو حلال وحرام اور دیگر مسائل فقہی کی تعلیم دیتے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ برادران اہل سنت کے تمام بڑے مذہبی رہنما کسی نہ کسی حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے علمی فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کی تمام کتب میں درج ہے کہ جناب ابوحنیفہ دو سال تک امام علیہ السلام سے پڑھتے رہے ہیں۔ جناب ابوحنیفہ کا ایک قول بہت مشہور ہے اور یہ قول تمام کتب اہل سنت میں موجود ہے

کہ ملت حنفیہ کے سربراہ جناب ابوحنیفہ نے فرمایا کہ

"لولا السنتان لهلك نعمان"

"اگر میں نے وہ دو سال امام علیہ السلام کی شاگردی میں نہ گزارے ہوتے تو میں ہلاک ہوجاتا۔"

جناب ابوحنیفہ کا اصل نام نعمان ہے۔کتب میں آپ کو نعمان بن ثابت بن زوطی بن مرزبان، کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔آپ کے آباؤاجداد ایرانی تھے۔

اسی طرح اہلسنت کے دوسرے امام جناب مالک بن انس امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہم عصر تھے۔ جناب مالک نے بھی امام علیہ السلام سے کسب فیض کیا اور عمر بھر اس پر فخر کرتے رہے۔ امام شافعی کا دور بعد کا دور ہے انہوں نے جناب ابوحنیفہ کے شاگردوں، مالک بن انس اور احمد بن حنبل سے استفادہ کیا۔لیکن ان کے اساتذہ کا سلسلہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے جاملتا ہے۔اپنے وقت کے چند علماء، فقہاء، محدثین امام جعفر صادق علیہ السلام کی علمی و دینی فیوضیات سے مستفیض ہوئے۔امام علیہ السلام کے حلقہ درس میں علماء وفضلاء کا ہمہ وقت ٹھٹھ لگا رہتا تھا۔اب میں اہل سنت کے بعض علماء کے امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں تاثرات پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ ہمارے محترم قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں جناب مالک کے تاثرات

جناب مالک بن انس مدینہ میں رہائش پزیر تھے۔نسبتاً خود پسند انسان تھے۔ان کا کہنا ہے کہ میں جب بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ کو ہمیشہ اور ہر وقت ہنستا مسکراتا ہوا پاتا۔

"وکان کثیر التبسم"

آپ کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کے پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے۔"

گویا آپ کو میں نے ہمیشہ خوش اخلاق پایا۔آپ کی ایک عادت یہ تھی کہ جب آپ کے سامنے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مبارک لیا جاتا تو آپ کے چہرے کا رنگ یکسر بدل جاتا۔ میں اکثر اوقات امام علیہ السلام کے پاس آتا رہتا تھا۔آپ اپنے زمانے کے عابد وزاہد انسان تھے۔تقویٰ و پرہیز گاری اور راستبازی میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔جناب مالک ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امام علیہ السلام کے ہمراہ تھا جب ہم مدینہ سے نکل کر مسجد الشجرہ پر پہنچے تو ہم نے احرام باندھ لیا ہم چاہتے تھے کہ لبیک کہیں اور رسمی طور پر محرم ہو جائیں، چنانچہ ہم نے لبیک کہنا شروع کیا اور احرام باندھا تو میری نگاہ امام علیہ السلام پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ اقدس کا رنگ یکسر بدل گیا ہے، اور آپ کا بدن کانپ رہا ہے۔یوں لگتا تھا کہ شاید سواری سے گر جائیں۔خدا خوفی کی وجہ سے آپ پر عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی۔میں نے عرض کیا اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اب آپ لبیک کہہ ہی دیں تو آپ نے فرمایا میں کیا

کہوں اور کیسے کہوں اگر میں لبیک کہتا ہوں؟ تو مجھے جواب ملے کہ لا لبیک تو اس وقت میں کیا کروں گا؟ اس روایت کو آقا شیخ عباس قمی اور دوسرے مورخین نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔اس روایت کے راوی جناب مالک بن انس ہیں جو اہل سنت حضرات کے بہت بڑے امام ہیں جناب مالک کا کہنا ہے کہ:

"ما رات عین ولا سمعت اذن ولا خطر علی قلب بشر افضل من جعفر بن محمد"

آنکھ نے نہیں دیکھا کان نے نہیں سنا اور کسی کے خیال خاطر میں نہیں آیا کہ کوئی شخص امام جعفر صادق علیہ السلام سے افضل نظر سے گزرا ہو۔"

محمد شہرستانی جو کتاب الملل والنحل کے مصنف ہیں آپ پانچویں ہجری میں بہت بڑے عالم، متکلم، فلاسفی ہو کر گزرے ہیں۔دینی و مذہبی اور فلسفیانہ اعتبار سے یہ کتاب دنیا بھر میں مشہور ہے۔مصنف کتاب ایک جگہ پر امام جعفر صادق علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"ھو ذو علم غریر"

کہ آپ کا علم ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔"

وادب کامل فی الحکمة"

حکمت میں ادب کامل تھے۔"

وزھد فی الدنیا وورع تام عن الشھوات"

آپ غیر معمولی پرمتقی و پرہیز گار تھے آپ خواہشات نفسانی سے دور رہتے تھے۔"

"ویفیض علی الموالی له اسرار العلوم ثم (دخل العراق)"

آپ سرزمین مدینہ میں رہ کر دوستوں اور لوگوں کو علم کی خیرات بانٹتے تھے۔" پھر آپ عراق تشریف لے آئے

یہ مصنف امام علیہ السلام کی سیاست سے کنارہ کشی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔"

ولا نازع فی الخلافة احدا"

"کہ آپ نے خلافت کے مسئلہ پر کسی سے کسی قسم کا اختلاف ونزاع نہ کیا۔"

اس کنارہ گیری کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ آپ علم ومعرفت کے سمندر میں غوطہ زن رہتے تھے اس لیے دوسرے کاموں کے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ میں محمد شہرستانی کی توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔ میرا مقصود اس سے یہ ہے کہ اس نے کھلے لفظوں میں امام کی غیر معمولی معرفت کا اعتراف کیا ہے لکھتا ہے۔

"ومن غرق فی بحر المعرفة لم یقع فی شط"

کہ جو دریائے معرفت میں ڈوبا ہوا ہو وہ خود کو کنارے پر نہیں لے آئے گا"

اس کے نزدیک خلافت وحکومت ایک سطحی سی چیزیں ہیں جبکہ علم ومعرفت کی بات ہی کچھ اور ہے۔

"ومن تعلیٰ الیٰ ذروة الحقیقة لم یخف من حط"

کہ جو حقیقت کی بلند وبالا چوٹیوں پر پہنچ جائے وہ نیچے کی طرف آنے سے کیسے ڈرے گا۔"

باوجودیکہ شہرستانی شیعوں کا مخالف شخص ہے، لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں مدحت سرائی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی کتاب الملل والنحل میں شیعوں کے

خلاف بہت زیادہ زہر اگلا ہے۔ لیکن اس نے امام علیہ السلام کو بہت ہی اچھے لفظوں کے ساتھ یاد کیا ہے۔ اگر چہ یہ دشمن تھا لیکن حقیقت کو ماننے پر مجبور ہو گیا۔ یہ نہ مانتا تو کیسے نہ مانتا؟ امام جعفر صادق علیہ السلام جیسا کوئی ہوتا تو یہ سامنے لاتا۔ سورج کا بھلا چراغوں سے کیسے مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ اب بھی دنیا میں ایسے علماء موجود ہیں جو شیعیت کے سخت دشمن ہیں۔ لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیحد احترام کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیعہ حضرات سے جن باتوں پر ہمارا اختلاف ہے۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیان کردہ باتوں میں نہیں ہے کیونکہ صادق آل محمد علیہم السلام ایک انتہائی باکمال شخصیت و بے نظیر حیثیت کے مالک انسان تھے اور آپ کی علمی خدمات اور دینی احسانات کو کبھی اور کسی طور بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

احمد آمین کی امام جعفر علیہ السلام کے بارے میں رائے

فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام، ظہر الاسلام، یوم الاسلام یہ احمد آمین کی معروف ترین کتب ہیں۔ احمد آمین ہمارے ہم عصر عالم دین ہیں۔ اور یہ شیعوں کے سخت مخالف ہیں۔ ان کو مذہب شیعہ کے بارے میں ذرا بھر علم نہیں ہے۔ سنی سنائی باتوں کو وجہ اعتراض بنا کر شیعوں کے خلاف اپنی کتابوں میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ حالانکہ اس سطح اور اس پائے کے عالم دین کو حق کو سامنے رکھ کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی جتنی تعریف کی ہے اتنی کسی اور سنی عالم نے نہیں کی۔ امام علیہ السلام کے فرامین اور ارشادات کی تفسیر وتشریح اس انداز میں کی ہے کہ کوئی عالم دین بھی نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ ملت اسلامیہ، مذہب جعفریہ کے بارے میں ذرا بھر بھی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کاش وہ شیعوں کے بارے میں حقیقت پسندی سے کام لیتے اور ایک عظیم اور شریف ملت پر الزامات عائد کر کے اپنی کتب کے صفحات کو سیاہ نہ کرتے؟

جاحظ کا اعتراف

میرے نزدیک جاحظ کی علمی صلاحیت اور دینی قابلیت دوسرے سنی علماء سے بڑھ کر ہے۔ یہ شخص دوسری صدی کے اواخر اور تیسری صدی کے اوائل کا سب سے بڑا عالم ہے۔ یہ شخص ذہانت ومطانت کا عظیم شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی حد تک صاحب مطالعہ تھا۔ جاحظ نہ صرف اپنے عہد کا بہت بڑا ادیب ہے بلکہ ایک بہت بڑا محقق اور مورخ بھی ہے انہوں نے حیوان شناسی پر ایک کتاب الحیوان تحریر کی تھی آج یہ کتاب یورپی سائنسدانوں کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ ماہرین حیوانات اس کتاب پر نئے نئے تحقیقات کر رہے ہیں۔ جانوروں اور حیوانات کے بارے میں اس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ کتاب اس دور میں لکھی گئی جب یونان اور غیر یونان میں جدید علوم نے اتنی ترقی نہ کی تھی۔ اس وقت ان کے پاس کسی قسم کا مواد نہ تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے حیوانات پر تحقیق کر کے دنیا بھر کے جدید وقدیم ماہرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

جاحظ ایک متعصب سنی عالم ہے۔ انہوں نے شیعوں کے ساتھ مناظرے بھی کئے اور انتہا پسندی کے باعث شیعہ حضرات ان کو ناصبی بھی کہتے ہیں۔ لیکن میں ذاتی طور پر کم از کم ان کو ناصبی نہیں کہہ سکتا۔ یہ شخص امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور کا عالم ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے امام علیہ السلام کا آخری دور پایا ہو؟ شاید یہ اس وقت بچہ ہو یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام علیہ السلام کا دور ایک نسل قبل کا دور ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا دور اور امام علیہ السلام ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔ بہر حال جاحظ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"جعفر بن محمد الذی ملأ الدنیا علمه و فقهه"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے پوری دنیا کو علم و دانش اور معرفت و حکمت سے پر کر دیا ہے۔"

ویقال ان اباحنیفة من تلامذته و کذلك سفیان الثوری"

کہا جاتا ہے کہ جناب ابو حنیفہ اور سفیان ثوری کا شمار امام علیہ السلام کے شاگردان خاص میں سے ہوتا ہے سفیان ثوری بہت بڑے فقیہہ اور صوفی ہو کر گزرے ہیں۔

میر علی ہندی کا نظریہ میر علی ہندی ہمارے ہم عصر سنی عالم ہیں وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"لا مشاحة ان انتشار العلم فی ذلك الحین قد ساعد علی فك الفکر من عقاله"

علوم کا پھیلاؤ اس زمانے میں ممکن بنایا گیا اور لوگوں کو فکری آزادی ملی اور ہر طرح کی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔"

فاصبحت المناقشات الفلسفیة عامة فی کل حاضرة من حواضر العالم الاسلامی"

" دنیا بھر کے اسلامی حلقوں میں علمی و عقلی اور فلسفیانہ مباحث کو رواج ملا۔"

جناب ہندی مزید لکھتے ہیں کہ:

"ولا یفوتنا ان نشیر الی ان الذی تزعم تلك الحرکة هو حفید علی ابن ابی طالب المسمی بالامام الصادق"

ہم سب کو یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ جس عظیم شخصیت نے دنیائے

اسلام میں فکری انقلاب کی قیادت کی ہے وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے پوتے ہیں اور انکا نام نامی امام صادق علیہ السلام ہے۔"

وهو رجل رحب افق التفکیر"

وہ ایسے انسان تھے کہ جن کا افق فکری بہت بلند ہے یعنی جن کی فکری وسعت کی کوئی حد نہ تھی۔"

"بعید اغوار العقل"

ان کی عقل و فکر بہت گہری تھی۔"

"ملم کل المام بعلوم عصره"

آپ اپنے عہد کے تمام علوم پر خصوصی توجہ رکھتے تھے۔ جناب ہندی مزید کہتے ہیں۔"

ویعتبر فی الواقع هو اول من اسس المدارس الفلسفیة المشهورة فی الاسلام"

درحقیقت سب سے پہلے جس شخصیت نے جدید علمی مراکز قائم کیے ہیں وہ امام جعفر صادق علیہ السلام ہی ہیں۔"

ولم یکن یحضر حلقته العلمیة اولئك الذین اصبحوا مؤسسی المذاهب الفقهیة فحسب بل کان یحضرها طلاب الفسفة والمتفلسفون من انحاء الواسعة"

وہ کہتا ہے کہ آپ نہ صرف ابو حنیفہ جیسی بزرگ شخصیت کے استاد تھے بلکہ جدید علوم کی بھی طلبہ کو تعلیم دیا کرتے تھے گویا جدید ترقی امام علیہ السلام کی مرہون منت ہے۔

احمد زکی صالح کے خیالات

کتاب امام صادق علیہ السلام میں آقائے مظفر احمد زکی صالح ماہنامہ الرسالۃ العصریہ سے نقل کرتے ہیں کہ شیعہ فرقہ کی علمی پیشرفت تمام فرقوں سے زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علوم کی ترقی اور پیشرفت میں اہل ایران کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ایران میں شیعوں کی اکثریت نہ تھی۔ ابھی ہم اس کے بارے میں بحث نہیں کرتے یہ پھر کبھی سہی یہ مصری لکھتا ہے:

"من الجلی الواضح لدی کل من درس علم الکلام الفرق الشیعة کانت انشط الفرق الاسلامیة حرکة"

کہ واضح سی بات ہے کہ ہر وہ شخص جو ذرا بھر علمی شعور رکھتا ہے وہ اس بات کا معترف ہے کہ شیعہ فرقہ کی مذہبی و علمی پیشرفت تمام فرقوں سے زیادہ ہے۔"

وکانت اولیٰ من اسس المذاهب الدینیة علی اسس فلسفیة حتیٰ ان البعض ینسب الفلسفة خاصة بعلی بن ابی طالب"

"یعنی شیعہ پہلا اسلامی مذہب ہے کہ جو دینی مسائل کو فکری و عقلی بنیادوں پر حل کرتا ہے۔

شیعہ یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں مختلف علوم کو عقلی و فکری لحاظ سے پرکھا جاتا تھا۔ اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اہل تسنن کی احادیث کی ان کتابوں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد و صحیح نسائی) میں صرف اور

صرف فروعی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ وضو کے احکام یہ ہیں، نماز کے مسائل کچھ اس طرح کے ہیں۔ روزہ، حج، جہاد، وغیرہ کے احکام یہ ہیں۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں اس طرح عمل فرمایا ہے لیکن آپ اگر شیعہ کی احادیث کی کتب کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے شیعہ احادیث میں سب سے پہلے عقل وجہل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، لیکن اہل سنت حضرات کی کتب میں اس طرح کی باتیں موجود نہیں ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی بنیاد صرف امام جعفر صادق علیہ السلام ہیں، بلکہ امام صادق علیہ السلام کے ساتھ ساتھ اس میں تمام آئمہ طاہرین علیہم السلام کی کوشش بھی شامل ہیں۔ اس کی اصل بنیاد تو خود حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اس عظیم مشن کا آغاز حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا اور اسے آگے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑھایا ہے۔

چونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو کام کرنے کا خوب موقعہ ملا ہے اس لیے آپ نے اپنے آباءواجداد کی علمی میراث کو کماحقہ محفوظ رکھا ہے۔ اور اس عظیم ورثہ کو قیامت تک آنے والی نسلوں کیلئے ثمر آور بنادیا۔ ہماری احادیث کی کتب میں کتاب العقل والجہل کے بعد کتاب التوحید آتی ہے۔ ہمارے پاس توحید الٰہی کے بارے میں ہزاروں مختلف احادیث موجود ہیں۔ ذات خداوندی، معرفت الٰہی، فضاء وقدر، جبر و اختیار سے متعلق ملت جعفریہ کے پاس نہ ختم ہونے والا ذخیرہ احادیث موجود ہے۔ شیعہ قوم فخر سے کہہ سکتی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور ہمارے جلیل القدر دیگر آئمہ طاہرین نے جتنا ہمیں دیا ہے اتنا کسی اور پیشوا نے اپنی ملت کو نہیں دیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری، علمی اور عقلی ونظریاتی لحاظ سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے نئے علوم کی بنیاد رکھ کر بنی نوع انسان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

جابر بن حیان

ایک وقت ایسا آیا کہ ایک نئی اور حیرت انگیز خبر نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا وہ تھی جابر بن حیان کی علمی دنیا میں آمد۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم ہیرو کو جابر بن حیان صوفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس دانائے راز نے علمی انکشاف اور سائنسی تحقیقات کے حوالے سے ایک نئی تاریخ رقم کر کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ابن الندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں جناب جابر کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جابر بن حیان ایک سو پچاس علمی و فلسفی کتب کے مصنف و مؤلف ہیں۔ کیمسٹری جابر بن حیان کے فکری احسانات کا صلہ ہے۔ ان کو کیمسٹری کی دنیا میں باپ اور بانی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ابن الندیم کے مطابق جناب جابر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دسترخوان علم سے خوشہ چینی کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔

ابن خلکان ایک سنی رائٹر ہیں۔ وہ جابر بن حیان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کیمسٹری کا یہ بانی امام جعفر صادق علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ دوسرے مورخین نے بھی کچھ اس طرح کی عبارت تحریر کی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن جن علوم کی جناب جابر نے بنیاد رکھی ہے وہ ان سے پہلے بالکل وجود ہی نہ رکھتے تھے۔ پھر کیا ہوا کہ جابر بن حیان نے نئی نئی اختراعات ایجاد کر کے جدید ترین دنیا کو حیران کر دیا۔ اس موضوع پر اب تک سینکڑوں کتابیں اور رسالہ جات شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا بھر کے سائنسدان اور ماہرین نے جناب جابر کی جدید علمی خدمات کو بیحد سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اگر جابر نہ ہوتے تو پوری انسانیت اتنے بڑے علم سے محروم رہتی۔ ایران کے ممتاز دانشور جناب تقی زادہ نے جابر بن حیان کی علمی و دینی خدمات پر انہیں زبردست خراج تحسین پیش

کیا ہے۔ میرے خیال میں جابر کے متعلق بہت سی چیزیں مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ شیعہ کتب میں بھی جناب جابر جیسے عظیم ہیرو کا تذکرہ بہت کم ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بعض شیعہ علم رجال اور حدیث کی کتابوں میں اسی بزرگ ہستی کا نام کہیں پہ استعمال نہیں ہوا۔ ابن الندیم شائد شیعہ ہو اس لئے انہوں نے جناب جابر کا نام اور تذکرہ خاص اہتمام اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پوری دنیا کو بالآخر ماننا پڑا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جس طرح لائق و فائق علماء تیار کئے ہیں اتنے اور کسی مذہب نے پیشوا نہیں کئے۔

ہشام بن الحکم

امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک اور معروف شاگرد کا نام ہشام بن الحکم ہے۔ یہ شخص واقعتاً نابغہ روزگار ہے، اپنے دور کے تمام دانشوروں پر ہمیشہ ان کو برتری حاصل رہی ہے۔ آپ جب بھی کسی موضوع پر بات چیت کرتے تو سننے والوں کو مسحور کر دیتے۔ اس مردقلندر کی زبان میں عجیب تاثیر تھی۔ جناب ہشام سے بڑے بڑے علماء آکر شوق وذوق کے ساتھ بحث ومباحثہ کرتے اور سمندر علم کی جولانیوں اور طوفان خیزیوں کو دیکھ کر وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کا اطمینان وسکون حاصل کرتے۔ یہ سب کچھ میں اہل سنت بھائیوں کی کتب سے پیش کر رہا ہوں۔ ابوالہزیل علاف ایک ایرانی النسل دانشور تھے۔ آپ علم کلام کے اعلیٰ پایہ کے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ شبلی نعمانی تاریخ علم کلام میں لکھتا ہے کہ ابوالہزیل کے مقابلے میں کوئی شخص بحث نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن یہی ابوالہزیل ہشام بن الحکم کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جناب ہشام نے جدید علوم میں جدید تحقیق کو رواج دیا۔ آپ نے طبعیات کے بارے میں ایسے ایسے اسرار ورموز کو بیان کیا ہے کہ وہ لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہ تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ رنگ و بو انسانی جسم کا ایک مستقل جزو ہے اور وہ ایک ایسی چیز ہے جو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

ابوالہزیل ہشام کے شاگردوں میں سے تھا اور وہ اکثر اپنی علمی آراء میں اپنے استاد محترم جناب ہشام کا حوالہ ضرور دیا کرتے تھے۔ اور ہشام امام جعفر صادق علیہ السلام کی شاگردی پر نہ فقط فخر کیا کرتے تھے بلکہ خود کو "خوش نصیب" کہا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے تعلیم وتربیت اور تہذیب و

تمدن کے فروغ اور احیاء کے لیے شب و روز کام کیا۔ فرصت کے لمحوں کو ضروری اور اہم کاموں پر استعمال کیا، چونکہ ہمارے آئمہ میں سے کسی کو کام کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا گیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام واحد ہستی ہیں کہ جنہوں نے بہت کم عرصے میں صدیوں کا کام کر دکھایا۔ پھر امام رضا علیہ السلام کو بھی علمی ودینی خدمات کے حوالے سے کچھ کام کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ ان کے بعد فضا بدتر ہوتی چلی گئی، حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا دور انتہائی مصیبتوں، پریشانیوں اور دکھوں کا دور ہے۔ آپ پر حد سے زیادہ پابندیاں عائد کر دی گئیں، بغیر کسی وجہ اور جرم وخطا کے آپ کو زندگی بھر زندانوں میں رہ کر اسیرانہ زندگی بسر کرنی پڑی۔

ان کے بعد دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام عالم جوانی میں شہید کر دیئے گئے۔ ان کا دشمن بھی کتنا بزدل تھا کہ اکثر کو زہر کے ذریعہ شہید کر دیا گیا۔ ان پر عرصہ حیات ا س لیے تنگ کر دیا تھا کہ وہ علم وعمل کے فروغ اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے کام نہ کرسکیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو ایک تو کام کرنے کا موقع مل گیا دوسرا آپ نے عمر بھی لمبی پائی تقریباً ستر (۷۰) سال تک زندہ رہے۔

اب یہ صورت حال کس قدر واضح ہوگئی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے ادوار میں کتنا فرق تھا؟ امام عالی مقام علیہ السلام کو ذرا بھر کام کرنے کا موقعہ نہ مل سکا، یعنی حالات ہی اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ مصیبتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے سخت پریشان رہے۔ پھر انتہائی بے دردی کے ساتھ آپ کو شہید کر دیا گیا، لیکن آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی مظلومیت نے پوری دنیا میں حق وانصاف کا بول بالا کر دیا اور ظالم کا نام اور کردار ایک گالی بن کر رہ گیا۔

امام حسین علیہ السلام کے لیے دو ہی صورتیں تھیں ایک یہ کہ آپ خاموش ہو کر بیٹھ جاتے اور عبادت کرتے دوسری صورت وہی تھی جو کہ آپ نے اختیار کی، یعنی میدان

جہاد میں اتر کر اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو حالات و واقعات نے کام کرنے کا وقت اور موقعہ فراہم کر دیا۔ شہادت تو آپ کو نصیب ہونی تھی۔ آپ کو جونہی موقعہ ملا آپ نے چہار سو علم کی شمعیں روشن کر کے جگہ جگہ روشنی پھیلا دی۔ علم کی روشنی اور عمل کی خوشبو نے ظلمت و جہالت میں ڈوبی ہوئی سوسائٹی کو از سر نو زندہ کر کے اسے روشن و منور کر دیا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آئمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی کا مقصد اور مشن اور طریقہ کار ایک جیسا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر امام صادق علیہ السلام نہ ہوتے تو امام حسین علیہ السلام بھی نہ ہوتے۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام نہ ہوتے تو امام صادق علیہ السلام نہ ہوتے۔ یہ ہستیاں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام نے ظلم اور باطل کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی۔ پھر آنے والے آئمہ اطہار علیہم السلام نے ان کے فلسفہ شہادت اور مقصد قیام کو عملی لحاظ سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اگرچہ حکومت وقت کے خلاف علانیہ طور پر جنگ شروع نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بھی پوری دنیا جانتی ہے کہ آپ حکام وقت سے نہ فقط دور رہے بلکہ خفیہ طور پر ان کے ساتھ بھرپور مقابلہ بھی کیا۔ ایک طرح کی امام علیہ السلام سرد جنگ لڑتے رہے۔ آپ علیہ السلام کی وجہ سے اس وقت کے ظالم حکمرانوں کی ظالمانہ کاروائیوں کی داستانیں عام ہوئیں اوران کی آمریت کا جنازہ اس طرح اٹھا کہ مستحق لعن ونفریں ٹھہرے، یہی وجہ ہے کہ منصور کو مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ:

"ھذا الشجی معترض فی الحلق"

جعفر بن محمد میرے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی کے مانند ہیں۔
میں نہ ان کو باہر نکال سکتا ہوں اور نہ نگلنے کے قابل رہا ہوں نہ میں ان کا

عیب تلاش کر کے ان کو سزا دے سکتا ہوں، اور نہ ان کو برداشت کر سکتا ہوں۔"

یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ ہمارے خلاف ہے ۔۔۔۔۔ برداشت کر رہا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ امام علیہ السلام نے ہمارے خلاف لوگوں کو ایک نہ ایک دن اکٹھا کر ہی لینا ہے۔ اس کے باوجود بھی میں اتنا بے بس ہوں کہ ان کے خلاف ذرا بھر اقدام نہیں کر سکتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام علیہ السلام نے اپنی حسن سیاست اور بہترین حکمت عملی کی بدولت اپنے مکار، عیار اور با اختیار دشمن کو بے بس کیے رکھا۔ ہم سب پر لازم ہے کہ اپنے دشمنوں، مخالفوں کے مقابلے میں ہمہ وقت تیار ہیں۔ ہوشیاری و بیداری کے ساتھ ساتھ ہمارا قومی وملی اتحاد بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمارا بزدل دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ کسی وقت بھی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے۔ طاقت وغلبہ کے تصور کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو وقت کی نبض تھام کر سوچ سمجھ کر آگے بڑھتے ہیں اور پھر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

علمی پیشرفت کے اصل محرکات

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور امامت میں غیر معمولی طور پر ترقی ہوئی ہے۔ معاشرہ میں فکر وشعور کو جگہ ملی گویا سوئی ہوئی انسانیت ایک بار پھر پوری توانائی کے ساتھ جاگ اٹھی، بحثوں، مذاکروں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ انہی مذاکرات سے اسلام کو بہت زیادہ فائدہ ہوا، علمی ترقی اور پیشرفت کے تین بڑے محرکات ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ پہلا سبب یہ تھا کہ اس وقت پورے کا پورا معاشرہ مذہبی تھا۔ لوگ مذہبی و دینی نظریات کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔

پھر قرآن و حدیث میں لوگوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ لوگوں سے کہا گیا تھا کہ جو جانتے ہیں وہ نہ جاننے والوں کو تعلیم دیں، حسن تربیت کی طرف بھی اسلام نے خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ محرک تھا کہ جس کی وجہ سے علم و دانش کی اس عالمگیر تحریک کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قافلے کے قافلے اس کا رواں علم میں شامل ہوگئے۔ دوسرا عامل یہ تھا کہ مختلف قوموں، قبیلوں، علاقوں اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ ان افراد کو تحصیل علم سے خاص لگاؤ تھا۔ تیسرا محرک یہ تھا کہ اسلام کو ہی وطن قرار دیا گیا یعنی جہاں اسلام ہے اس شہر، علاقے اور جگہ کو وطن سمجھا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس وقت جتنے بھی ذات پات اور نسل پرستی تصورات تھے وہ اسی وقت دم توڑ گئے۔ اخوت و برادری کا تصور رواج پکڑنے لگا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اگر استاد مصری ہے تو شاگرد خراسانی یا شاگرد مصری ہے تو استاد خراسانی، ایک بہت بڑا دینی مدرسہ تشکیل دیا

گیا۔ آپ کے حلقہ درس میں نافع، عکرمہ جیسے غلام بھی درس میں شرکت کرتے ہیں، پھر عراقی، شامی، حجازی، ایرانی، اور ہندی طلبہ کی رفت و آمد شروع ہوگئی۔ دینی ادارے کی تشکیل سے لوگوں کا آپس میں رابطہ بڑھا اور اس سے ایک ہمہ گیر انقلاب کا راستہ ہموار ہوا۔ اس زمانے میں مسلم، غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری موجود تھے۔ وہ مسلمانوں اور ان کے علماء کا دلی طور پر احترام کرتے بلکہ غیر مسلم مسلمانوں کے علم و تجربہ سے استفادہ کرتے۔ پھر کیا ہوا؟ کہ دوسری صدی میں مسلمانوں کی اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا عیسائیوں کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کرنا کافی حد تک مفید ثابت ہوا۔ حدیث میں بھی ہے کہ اگر آپ کو کسی علم یا فن کی ضرورت پڑے اور مسلمانوں کے پاس نہ ہو تو وہ غیر مسلم سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں اس چیز کی تاکید کی گئی ہے اور علامہ مجلسی (رح) نے بحار میں تحریر فرمایا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"خذوا الحكمة ولو من مشرك"

"یعنی اگر آپ کو مشرک سے بھی علم و حکمت حاصل کرنا پڑے تو وہ ضرور حاصل کریں"۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ:

"الحكمة ضالة المؤمن يأخذها اينما وجدها"

"یعنی حکمت مومن کا گم کردہ خزانہ ہے اس کو حاصل کرو چاہے جہاں سے بھی ملے۔"

بعض جگہوں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"ولو من ید مشرك"

کہ خواہ پڑھانے والا مشرک ہی کیوں نہ ہو۔"

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

" اور جس کو (خدا کی طرف سے) حکمت عطا کی گئی تو اس میں شک ہی نہیں کہ اسے خوبیوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی۔" (بقرہ،۲۶۹۔)

واقعاً صحیح ہے کہ علم مومن کا گمشدہ خزانہ ہے اگر انسان کی کوئی چیز گم ہو جائے تو وہ اس کے لئے کتنا پریشان ہوتا ہے اور اس کو کس طرح تلاش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی ایک قیمتی انگوٹھی ہو اگر وہ گم ہو جائے، تو آپ جگہ جگہ چھان ماریں گے اور اگر وہ آپ کو مل جائے تو بہت زیادہ خوشی ہوگی۔ علم سے زیادہ قیمتی چیز کونسی ہوسکتی ہے اس کو تلاش کرنے اور طلب کرنے کیلئے انسان کو اتنی محنت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ تعلیم دینے والا اور فن سیکھانے والا مومن و مسلمان ہی ہو، بلکہ آپ علوم اور جدید ٹیکنالوجی کافروں، مشرکوں سے بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے" مومن علم کو کافر کے پاس عارضی مال کے طور پر دیکھتا ہے اور خود کو اس کا اصلی مالک سمجھتا ہے" اور وہ خیال کرتا ہے کہ علم کا لباس مومن ہی کو جچتا ہے کافر کو نہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اس بات کا سبب بنا کہ وہ تحقیق و تلاش کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان، عیسائی، یہودی، مجوسی وغیرہ سب ایک جگہ، ایک شہر،

ایک محلّہ میں رہتے تھے۔ وہ انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ بات پورے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ مشہور مورخ جرجی زیدان نے اس وسعت قلبی کو انسانی معاشرہ بالخصوص مسلمانوں کے لیے نیک شگون قرار دیا ہے۔ وہ سید رضی کے واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سید رضی اپنے دور کے بہت بڑے عالم دین تھے بلکہ غیر معمولی طور پر درجہ اجتھاد پر فائز تھے۔ آپ سید مرتضی علم الہدیٰ کے چھوٹے بھائی تھے جب ان کے ہم عصر عالم دین ابو اسحٰق صابی نے انتقال کیا تو رضی نے ان کی شان مین ایک قصیدہ کہا۔ ابو اسحٰق صابی مسلمان نہ تھے یہ مجوسی فرقے سے ملتے جلتے خیالات کے حامل تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ عیسائی ہوں۔ یہ اعلیٰ پایہ کے ادیب، ممتاز دانشور تھے۔ ادیب ہونے کے ناطے سے قرآن مجید سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں قرآن مجید کی متعدد آیات کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ ماہ رمضان میں دن کو کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ ایک غیر مسلم ہیں تو رمضان میں دن کو کھاتے پیتے کیوں نہیں ہیں تو کہا کرتے تھے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم افراد معاشرہ کا احترام کرتے ہوئے ان کی مذہبی اقدار کا احترام کریں چنانچہ سید رضی نے کہا۔

ارایت من حملوا علی الاعواد

ارایت کیف خبا ضیاء النادی

کیا آپ نے دیکھا کہ یہ کون شخص تھا کہ جس کو لوگوں نے تابوت میں رکھ کر اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا؟ کیا آپ نے سمجھا ہے کہ ہماری محفلوں کا چراغ بجھ گیا ہے؟ یہ ایک پہاڑ تھا جو گر گیا کچھ لوگوں نے سید رضی پر اعتراض کیا کہ آپ ایک سید، اولاد پیغمبر اور بزرگ عالم دین ہوتے ہوئے ایک کافر کی تعریف کی ہے؟ فرمایا جی ہاں:

"انما رثیت علمه"

کہ میں نے اس کے علم کا مرثیہ کہا ہے۔"

وہ ایک بہت بڑا عالم تھا، دانشمند تھا میں نے اس پر اس لیے مرثیہ کہا کہ اہل علم ہم سے جدا ہو گیا ہے، اگر اس زمانے میں ایسا کیا جائے تو لوگ اس عالم کو شہر بدر کر دیں گے۔ جرجی زیدان کہتا ہے کہ ایک جلیل القدر عالم دین نے حسن اخلاق اور رواداری کا مظاہرہ کر کے اپنی خاندانی عظمت اور اسلام کی پاسداری کا عملی ثبوت دیا ہے۔ سید رضی حضرت علی علیہ السلام کے ایک لحاظ سے شاگرد تھے۔ کہ انہوں نے مولا امیر المومنین علیہ السلام کے بکھرے ہوئے کلام کو جمع کر کے نہج البلاغہ کے نام سے ایک ایسی کتاب تالیف کی کہ جسے قرآن مجید کے بعد بہت زیادہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سید رضی اپنے جد امجد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کی تعلیمات سے بہت زیادہ قریب تھے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ علم و حکمت جہاں کہیں بھی ملے اسے لے لو۔ یہ تھے وہ محرکات کہ جن کی وجہ سے لوگوں میں فکری و نظریاتی اور شعوری طور پر پختگی پیدا ہوئی اور تعلیم و تربیت، علم و عمل کے حوالے سے جتنی بھی ترقی ہے یہ سب کچھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ پس ہماری گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر چہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو ظاہری حکومت نہیں ملی اگر مل جاتی تو آپ اور بھی بہتر کارنامے انجام دیتے لیکن آپ کو جس طرح اور جیسا بھی کام کرنے کا موقعہ ملا آپ نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر بے شمار قابل ستائش کام کیے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جتنے بھی علمی و دینی کارنامے تاریخ میں موجود ہیں وہ سب صادق آل محمد علیہ السلام کے مرہون منت ہیں۔

شیعہ تعلیمی مراکز تو روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ اہل سنت بھائیوں کے

تعلیمی و دینی مراکز میں امام علیہ السلام کے پاک و پاکیزہ علوم کی روشنی ضرور پہنچی ہے۔ اہل سنت حضرات کی سب سے بڑی یونیورسٹی الازہر کو صدیوں قبل فاطمی شیعوں نے تشکیل دیا تھا اور جامعہ ازہر کے بعد پھر اہل تسنن کے مدرسے اور دینی ادارے بنتے چلے گئے۔ ان لوگوں کے اس اعتراض (کہ امام علیہ السلام میدان جنگ میں جہاد کرتے تو بہتر تھا؟) کا جواب ہم نے دے دیا ہے ان کو یہ بات بھی بغور سننی چاہیے کہ اسلام جنگ کے ساتھ کبھی نہیں پھیلا بلکہ اسلام تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ مسلمان کو صرف دفاع کرنے کا مجاز ہے، آپ اسے جہاد کے نام سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ امام علیہ السلام کی حلم و بردباری اور حسن تدبر نے نہ فقط ماحول کو خوشگوار بنایا بلکہ لوگوں کو شعور بخشا، علم جیسی روشنی سے مالا مال کر دیا، اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و رفعت میں اضافہ ہوا۔

باقی رہا یہ سوال کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام عنان حکومت ہاتھ میں لے کر اسلام اور مسلمانوں کی بخوبی خدمت کر سکتے تھے انہوں نے اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھایا پر امن رہنے کے باوجود بھی ان کو جام شہادت نوش کرنا پڑا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حالات اس قدر بھی سازگار و خوشگوار نہ تھے کہ آئمہ اطہار علیہم السلام کو حکومت و خلافت مل جاتی؟ امام علیہ السلام نے حکمرانوں سے ٹکرانے کی بجائے ایک اہم تعمیری کام کی طرف توجہ دی۔ علماء فضلاء، فقہاء اور دانشور تیار کر کے آپ نے قیامت تک کے انسانوں پر احسان عظیم کر دیا۔ وقت وقت کی بات ہے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے ہر حال، ہر موقعہ پر اسلام اور مظلوم طبقہ کی بھرپور طریقے سے ترجمانی کی۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کو مامون کی مجلس میں جانے کا موقعہ ملا آپ نے سرکاری محفلوں اور حکومتی میٹنگوں میں حق کی کھل کر ترجمانی کی اور جیسے بھی بن پڑا غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی۔ امام رضا علیہ السلام دو سال تک مامون کے قریب رہے۔ اس دور میں آپ سے کچھ نہ کچھ احادیث نقل کی گئیں اس کے بعد آپ کی کوئی حدیث نظر نہیں آتی۔ دوسرے لفظوں میں

مامون کے دور میں آپ کو دین اسلام کی ترویج کیلئے کام کرنے کا موقعہ ملا اس کی وجہ مامون کی قربت ہے اس کے بعد پابندیوں کا دور شروع ہو گیا۔ آپ جو کرنا چاہتے تھے وہ بندشوں اور رکاوٹوں کی نظر ہو گیا۔ پھر آپ کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ جو آپ کے باپ دادا کے ورثہ میں شامل تھا۔

ایک سوال اور ایک جواب سوال

کیا جابر بن حیان نے ذاتی طور پر امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم حاصل کیا تھا؟

جواب: میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک سوال ہے جو تاریخ میں واضح نہیں ہے ابھی تک تاریخ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ جابر بن حیان نے سوفی صد امام جعفر صادق علیہ السلام سے درس حاصل کیا ہے۔ البتہ کچھ ایسے مورخین بھی ہیں جو جابر کو امام علیہ السلام کا شاگرد تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جابر کا زمانہ امام علیہ السلام کے بعد کا دوران ہے ان کے مطابق جابر امام علیہ السلام کے شاگردوں کا شاگرد ہے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ جابر نے براہ راست امام علیہ السلام سے کسب فیض کیا ہے۔ جابر نے ان علوم میں مہارت حاصل کی ہے کہ جو پہلے موجود نہ تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف شعبوں میں اپنے ہونہار شاگرد تیار کیے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس سمندر علم سے ہر کوئی اپنی اپنی پیاس بجھا کر جائے۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام نے کمیل بن زیاد سے فرمایا ہے:

"ان ھھنا لعلما جما لو اصبت له حملة" [1]

آپ نے اپنے سینہ اقدس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا دیکھو یہاں علم کا بڑا ذخیرہ

[1] نہج البلاغہ، ۱۳۹۔

موجود ہے کاش! اس کے اٹھانے والے مجھے مل جاتے۔" ہاں کوئی تو ایسا؟ جو ذہین تو ہے نا قابل اطمینان ہے اور دنیا کے لیے دین کو آلہ کار بنانے والا ہے۔ یا جو ارباب حق و دانش کا مطیع تو ہے مگر اس کے دل کے گوشوں میں بصیرت کی روشنی نہیں ہے یا ایسا شخص ملتا ہے کہ جو لذتوں پر مٹا ہوا ہے یا ایسا شخص جو جمع آوری و ذخیرہ اندوزی پر جان دیئے ہوئے ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت اور اس کے محرکات

"انتم الصراط الاقوم والسبیل الاعظم وشهداء دار الفناء وشفعاء دار البقاء" [1]

" آپ ہی صراط اقوم (بہت ہی سیدھا راستہ) ہیں، عظیم ترین راستہ (وسیلہ) اس فانی دنیا کے گواہ، باقی رہنے والی دنیا کے شفیع ہیں۔"

چونکہ حضرت امام زمانہ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم اور مشیت سے زندہ ہیں ان کے علاوہ باقی آئمہ طاہرین علیہم السلام جام شہادت نوش فرما چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی امام بھی طبعی موت یا کسی بیماری کی وجہ سے اس دنیا سے نہیں گیا۔ ہمارے آئمہ اطہار شہادت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمارا ہر امام ہمیشہ اپنے لیے خدا سے شہادت کی دعا کرتا ہے۔ پھر انہوں نے جو ہمیں دعائیں تعلیم فرمائی ہیں ان میں بھی شہادت سب سے پسندیدہ چیز متعارف کی گئی ہے جیسا کہ ہمارا آقا و مولا حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ میں بستر کی موت کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ مجھ پر ہزار ٹوٹ پڑنے والی تلواریں اور ہزاروں زخم اس سے کہیں بہتر ہیں کہ میں آرام سے بستر کی موت مروں۔ ان کی دعاؤں میں یہی التجاء ہے، تمناؤں میں یہی تمنا، آرزوؤں میں یہی آرزو، مناجات میں یہی دعا ہے کہ خدا ہمیں شہادت کے سرخ خون سے نہلا کر

[1] زیارت جامعہ کبیرہ۔

اپنی ابدی زندگی عطا فرما، غیرت ورحمیت، حریت، وعظمت میری زندگی کا نصب العین ٹھہرے۔ زیارت جامعہ کبیرہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

"انتم الصراط الاقوم، والسبیل الاعظم و شهداء دار الفناء وشفعاء دار البقاء"

کہ آپ بہت ہی سیدھا راستہ، عظیم ترین شاہراہ آپ اس جہان کے شہید اور اس جہان کے شفاعت کرنے، بخشوانے والے ہیں۔"

لفظ شہید امام حسین علیہ السلام کی ذات گرامی کے ساتھ وقف کیا گیا ہے ہم عام طور پر جب بھی آپ کا نام لیتے ہیں" تو الحسین الشہید" کہتے ہیں اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ صادق اور امام موسیٰ ابن جعفر کا لقب موسیٰ الکاظم اور سید الشہداء کا لقب حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام میں سے امام حسین علیہ السلام ہی شہید ہوئے ہیں؟ اس طرح موسیٰ ابن جعفر کے ساتھ کاظم کا لقب ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف وہی کاظم ہیں، امام رضا علیہ السلام کے ساتھ الرضا کا لقب خاص ہے اس کا یہ معنی نہیں کہ دوسرے ائمہ رضا نہیں ہیں اگر امام جعفر صادق علیہ السلام کو صادق کہتے ہیں تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ دوسرے ائمہ صادق نہیں ہیں۔ یہ سارے کے سارے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہیں اور علی علیہ السلام بھی ان کی زندگی ایک دوسرے کی زندگی کا عکس ہے۔ تاثیر بھی ایک، خوشبو بھی، ایک سلسلہ نسب بھی ایک مقصد حیات بھی ایک۔

جہاد اور عصری تقاضے

یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ تمام ائمہ اطہار علیہم السلام شہید کیوں ہوئے ہیں؟ حالانکہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے سوا کوئی امام تلوار لے کر

میدان جہاد میں نہیں آیا۔ امام سجاد علیہ السلام خاموشی کے باوجود شہید کیوں ہوئے؟ اسی طرح امام باقر علیہ السلام، امام صادق علیہ السلام امام موسی کاظم علیہ السلام اور باقی تمام ائمہ شہید کیوں ہوئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہوگی کہ اگر یہ سمجھیں کہ امام حسین علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہ السلام کے انداز جہاد میں فرق ہے؟ اسی طرح کچھ ناسمجھ لوگ تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام ظالم حکمرانوں کے ساتھ لڑنے کو ترجیح دیتے تھے اور باقی ائمہ خاموشی کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ درحقیقت اعتراض کرنے والے یہ کہہ کر بہت غلطی کرتے ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو حقیقت حال کو جانچنا اور پہچاننا چاہیے۔ ہمارے ائمہ طاہرین علیہ السلام میں سے کوئی امام ظالم حکومت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی وہ اس لیے خاموش رہتے تھے کہ ظالم حکمران حکومت کرتے رہیں۔ حالات و واقعات کا فرق تھا موقعہ محل کی مناسبت کے ساتھ ساتھ جہاد میں بھی فرق ہے۔ کسی وقت ان کو مجبوراً تلوار اٹھانا پڑی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حالات میں سخت گھٹن پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ لوگوں کا سانس لینا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے کسی امام نے بھی حکومت وقت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا بلکہ وہ ظالموں، آمروں کو بار بار ٹوکتے اور ان کے مظالم کے خلاف آواز حق بلند کرتے تھے۔

آپ اگر ائمہ طاہرین علیہ السلام کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آل محمدؑ نے ہمیشہ اور ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور مظلوموں کی نہ صرف حمایت کی بلکہ ان کی ہر طرح کی مدد بھی کی۔ جب کبھی ان کی اپنے دور کے حکمران سے ملاقات ہوتی تھی تو وہ اس کے منہ پر ٹوک دیتے تھے۔ آپ کو تاریخ میں یہ کبھی نہیں ملے گا کہ آئمہ اطہارؑ میں کسی امام نے کسی حکمران کی حمایت کی ہو۔ وہ ہمیشہ مجاہدت میں رہے۔ تقیہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ آرام وسکون سے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے تقیہ وقتی

سے جیسا کہ تقویٰ کا مادہ بھی وقی ہے۔ تقیہ کا معنی یہ ہے کہ خفیہ طور پر اپنا اور اپنے نظریے کا دفاع کرنا۔ ہمارے ائمہ طاہرین علیہ السلام تقیہ کی حالت میں جو جو کارنامے سرانجام دیتے شاید تلوار اٹھانے کی صورت میں حاصل نہ ہوتے۔ ہمارے ائمہ کی بہترین حکمت عملی، حسن تدبر اور مجاہدت کی زندگی بسر کرنا ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ وقت گزر گیا مورخین نے لکھ دیا کہ آل محمدؑ حق پر تھے۔ ان کا ہر کام اپنے جد امجد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس ترین دین کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے تھا۔ آج ان کا دشمن دنیا بھر کے مسلمانوں کے نزدیک قابل نفرین اور مستحق لعنت ہے۔ صدیاں بیت گئیں۔ عبدالملک مروان، اولاد عبدالملک، عبدالملک کے بھتیجے بنی العباس، منصور دوانیقی، ابو العباس سفاح، ہارون الرشید، مامون ومتوکل تاریخ انسانیت کے بدنام ترین انسان شمار کیے جاتے ہیں۔ ہم شیعوں کے نزدیک یہ لوگ غاصب ترین حکمران تھے انہوں نے شریعت اسلامیہ کو جتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اس پر ان کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اگر ہمارے ائمہ طاہرین علیہ السلام ان کے خلاف جہاد نہ کرتے تو وہ اس سے بڑھ کر بلکہ علانیہ طور پر فسق و فجور کا مظاہرہ کرتے، نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مخلص نہتھے ائمہ طاہرینؑ کے ساتھ مقابلہ کرنے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ظاہری طور پر اسلام کا نام لیتے اور علمی مراکز اور مساجد قائم کرکے لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے کہ وہ پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ لیکن ائمہ حق نے نہ صرف ان کے منافقانہ چہروں سے نقاب اٹھا کر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ لوگوں کو بھی راہ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔

اگر آل محمدؑ ان ظالموں کے خلاف مجاہدت ومقاومت نہ کرتے تو آج تاریخ اسلام میں ان جیسے منافق، خودنما مسلمان حکمرانوں کو اسلام کے ہیرو کے طور پر متعارف کرایا جاتا۔ اگر چہ کچھ اب بھی ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔لیکن مسلمان کی اکثریت تاریخی حقائق کو ان کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتی۔
اس نشست میں ہم امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کی وجوہات اور محرکات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ امام علیہ السلام کو شہید کیوں کیا گیا؟ آپ کو سالہا سال کی قید با مشقت اور اسیری کے انتہائی تکلیف دہ ایام گزارنے کے باوجود آپ کو زہر دے کر شہید کیوں کر دیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پر بے پناہ مظالم ڈھانے کے بعد بھی وہ امام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب وہ ہر طرح سے ناکام و نامراد ہو گئے تو استقامت اور پائیداری کے اس عظیم المنزلت پہاڑ کو بزدلانہ حرکت کے ذریعہ گرانے کی ناکام کوشش کی گئی کہ آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

امامؑ زندان بصرہ میں

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ایک زندان میں نہیں رکھا گیا بلکہ آپ کو مختلف زندانوں میں رکھا جاتا۔ آج ایک زندان میں تو کل کسی اور زندانوں میں منتقل کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دینا مقصود تھا اور دوسری وجہ آپ جس جیل میں جاتے وہاں کے قیدی آپ کے مرید بن جاتے۔ سب سے پہلے امام کو عیسیٰ بن ابی جعفر منصور کے زندان میں بھیجا گیا۔ یہ منصور دوانیقی کا پوتا تھا اور بصرہ کا گورنر تھا امام علیہ السلام کی نگرانی اس کے ذمہ تھی۔ یہ عیاش ترین شخص تھا۔ ہر وقت نشہ میں مدہوش رہتا اور رقص وسرود، ناچ گانے کی محفلیں منعقد کرتا تھا۔ ایک کسان کے بقول کہ اس عارف خدا ترس، عابد و زاہد انسان کو ایسی جگہ پر قیدی بنا کر لایا گیا کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آپ کے کانوں میں ناچنے گانے والوں کی آوازیں آتی تھیں۔ ایسی آوازیں کہ آپ نے زندگی بھر نہ سنی تھیں۔ ۷ ذی الحجہ سال ۱۷۸ کو امام علیہ السلام کو زندان بصرہ میں لایا گیا۔ عید الاضحیٰ کا دن تھا اس لیے لوگ خوشیاں اور جشن

منا رہے تھے۔ آپ کو روحانی و ذہنی لحاظ سے بہت زیادہ تکلیف پہنچائی گئی۔
آپ علیہ السلام ایک طویل مدت تک اس زندان میں رہے۔ عیسیٰ بن جعفر آہستہ آہستہ آپ کا مرید ہو گیا۔ وہ پہلے آپ کے بارے میں کچھ اور خیال کرتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام حکومت و سیاست کیلئے کوشاں ہیں لیکن اس نے جب دیکھا کہ امام علیہ السلام تو بہت ہی عظیم اور عبادت گزار شخصیت ہیں۔ اس کے بعد اس کی سوچ یکسر بدل گئی چنانچہ اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ امام علیہ السلام کے لیے بہترین کمرہ مہیا کیا جائے۔ آپ کا غیر معمولی طور پر احترام کیا جانے لگا۔ ہارون نے اسے پیغام بھیجا کہ اس قیدی کا خاتمہ کر دے۔ عیسیٰ نے جواب میں کہا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ قیدی مجھ سے واپس لے لیا جائے۔ ورنہ میں ان کو آزاد کر دوں گا۔ میں اس قسم کے عظیم انسان کو اپنے قید خانے میں نہیں رکھ سکتا چونکہ وہ خلیفہ وقت کا چچا زاد بھائی اور منصور کا پوتا تھا اس لیے اس کی بات میں وزن تھا اور امام کو کسی دوسرے زندان میں منتقل کر دیا گیا۔

امام علیہ السلام مختلف زندانوں میں

حضرت امام موسیٰ کاظم کو بغداد لایا گیا یہاں پر فضل بن ربیع مشہور داروغہ تھا۔ امام علیہ السلام کو اس کے سپرد کر دیا گیا۔ اس پر تمام خلفاء اعتماد کرتے تھے۔
ہارون نے اس سے خاص تاکید کی تھی کہ امام علیہ السلام کے ساتھ کسی قسم کی نرمی نہ برتے بلکہ جتنا ہو سکے ان پر سختی کی جائے لیکن فضل امام کے معصومانہ کردار کو دیکھ کر پسیج گیا اور آپ کا عقیدت مند بن گیا۔ سختی کی بجائے نرمی سے پیش آنے لگا۔ زندان کے کمرے کو ٹھیک کیا اور امام علیہ السلام کو قدرے سہولتیں فراہم کیں۔ جاسوس نے ہارون کو خبر دی کہ امام موسیٰ کاظم فضل بن ربیع کے زندان میں آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر

کررہے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ زندان نہیں ہے بلکہ مہمان سرا ہے۔ ہارون نے امام علیہ السلام کو اس سے لے کر فضل بن یحییٰ برمکی کی نگرانی میں دے دیا۔ فضل بن یحییٰ بھی کچھ عرصہ کے بعد امام علیہ السلام سے محبت کرنے لگا۔ ہارون کو جب اس کے رویے کی تبدیلی کی خبر ملی تو سخت غضبناک ہوا اور اپنے جاسوس کو بھیجا کہ جا کر معاملہ کی تحقیق کریں۔ جب جاسوس آئے تو معاملہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہارون کو بتایا گیا تھا۔ ہارون فضل برم، کی پر سخت ناراض ہوا اس کا باپ وزیر تھا، یہ ایرانی النسل تھا۔ بہت ہی ملعون شخص تھا۔ اس کو ڈر لاحق ہوا کہ کہیں اس کا بیٹا خلیفہ کی نظروں میں گر نہ جائے، یہ فوری طور پر ہارون کے پاس آیا اور کہا کہ وہ اس کے بیٹے کی غلطی کو معاف کر دے۔ اس کی جگہ پر میں معافی مانگتا ہوں۔ اور میرا بیٹا بھی اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ پھر وہ بغداد آیا امام علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی نگرانی سے لے کر سندی بن شاہک کی نگرانی میں دیا۔ یہ انتہائی ظالم اور سفاک آدمی تھا اور مسلمان بھی نہ تھا، اس لیے امام علیہ السلام کے بارے میں اس کے دل ذرا بھر رحم نہ تھا۔ پھر کیا ہوا؟ امام علیہ السلام پر سختی کی جانے لگی اس کے بعد میرے آقا نے کسی لحاظ سے سکون نہیں دیکھا۔

ہارون کا امام علیہ السلام سے تقاضا

امام علیہ السلام کے زندان میں آخری دن تھے، یہ تقریباً شہادت سے ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ ہارون نے یحییٰ برمکی کو امام علیہ السلام کے پاس بھیجا اور انتہائی نرم اور ملائم لہجہ کے ساتھ اس سے کہا کہ میری طرف سے میرے چچا زاد بھائی کو سلام کہنا اور ان سے یہ بھی کہنا کہ ہم پر ثابت ہو چکا ہے کہ آپ بے قصور ہیں آپ کا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن افسوس کہ میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ اس کو توڑ نہیں سکتا۔ میری قسم یہ کہ جب تک آپ اپنے گناہ کا اعتراف نہ کریں گے اور مجھ سے معافی نہیں مانگیں گے تو آپ کو

آزاد نہیں کروں گا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے آپ صرف یحییٰ کے سامنے اعتراف جرم کر لیں۔ میرے سامنے معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اعتراف جرم کے وقت بہت سے لوگ موجود ہوں میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ اپنی قسم نہ توڑوں۔ آپ یحییٰ برمکی کے سامنے اعتراف گناہ کر لیں اور صرف اتنا کہہ دیں کہ معافی چاہتا ہوں، میں نے غلطی کی ہے مجھے معاف کر دیجئے تو میں آپ کو آزاد کر دوں گا۔ اس کے بعد میرے پاس تشریف لے آیئے اور میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کروں گا۔

اب اس استقامت کوہ گراں کی طرف دیکھیے۔ یہ شفیع روز جزاء کیوں ہیں؟ یہ شہید کیوں ہو جاتے ہیں؟ یہ ایمان اور اپنے نظریہ کی پختگی کی وجہ سے شہید کیے گئے اگر یہ سب آئمہ اپنے موقف کو بدل دیتے اور احکام وقت کی ہاں میں ہاں ملاتے تو ہر طرح کا آرام و سکون حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن رات اور دن اور حق و باطل، روشنی اور تاریکی، سچ اور جھوٹ ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔ بھلا امام وقت کسی حاکم وقت کے ساتھ کس طرح سمجھوتہ کر سکتا ہے؟! آپ نے یحییٰ کو جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ ہارون سے کہہ دینا کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں اس کے بعد تو جان اور تیرا کام جانے۔ ہم نے جو کرنا تھا وہ کر چکے۔ اس کے بعد میرے آقا کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

امام علیہ السلام کی گرفتاری کی وجہ

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ہارون نے امام علیہ السلام کو گرفتار کرنے کا حکم کیوں دیا تھا؟ اس لیے کہ وہ امام علیہ السلام کی عوام میں غیر معمولی مقبولیت کے باعث آپ سے حسد کرتا تھا اور اس کو یہ بھی ڈر تھا کہ لوگ ہمیں چھوڑ کر امام علیہ السلام کو اپنا مذہبی و سیاسی رہنما نہ بنا لیں۔ ہارون دیگر خلفاء کی مانند آل محمد علیہم السلام کے ہر فرد سے ہراساں رہتا وہ اس

خدشہ کے تحت ہمیشہ چوکنا رہتا تھا کہ آل رسول کہیں انقلاب نہ لے آئیں۔ وہ روحانی و نظریاتی انقلاب سے بھی ڈرتے تھے۔ اس لیے وہ لوگوں کو آئمہ طاہرین علیہم السلام کے ساتھ ملنے نہ دیا کرتے، لوگوں کی آمدورفت پر مکمل طور پر پابندی تھی۔ جب ہارون نے چاہا کہ اپنے بیٹوں امین اور اس کے بعد مامون اور اس کے بعد موتمن کی ولیعہدی کا دوبارہ رسمی طور پر اعلان کرے تو وہ شہر کے علماء اور زعماء کو دعوت کرتا ہے کہ وہ مکہ میں اس سلسلے میں بلائی جانے والی عالمی کانفرنس میں شرکت کریں اور سب لوگ اس کی دوبارہ بیعت کریں لیکن سوچتا ہے کہ اس منصوبہ اور پروگرام کے سامنے رکاوٹ کون ہے؟ وہ کون ہے کہ جس کی موجودگی خلیفہ کے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی کرسکتی ہے۔ کون ہے وہ کہ جس کی علمی استعداد اور پاکیزگی کردار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

کون ہے وہ کہ جس کی معصومانہ کشش اور مظلومانہ انداز احتجاج اس کی حکومت ظلم کی چولیں ہلا سکتا ہے؟ ظاہر ہے وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ مدینہ آتے ہی امام علیہ السلام کی گرفتاری کا آرڈر جاری کر دیتا ہے۔ یہی یحییٰ برمکی ایک شخص سے کہتا ہے کہ مجھے گمان ہے کہ خلیفہ وقت آج نہیں تو کل امام علیہ السلام کو گرفتار کرنے کا حکم صادر کر دے گا۔ اس شخص نے پوچھا وہ کیسے؟ بولا میں خلیفہ مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گئے تو اس نے اس انداز میں حضور پر سلام کیا السلام علیک یا ابن العم۔ سلام ہو آپ پر اے میرے چچا کے بیٹے۔ آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کے بیٹے موسیٰ کاظم کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوں (گویا وہ پیغمبر اسلام کے سامنے بھی جھوٹ بول رہا تھا) اگر میں ایسا اقدام نہ کروں تو ملک میں بہت بڑا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ اجتماعی اور ملکی مفاد کیلئے کچھ دیر کیلئے امام علیہ السلام کو نظربند کر رہا ہوں۔ یا رسول اللہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یحییٰ نے اپنے ساتھی سے کہا دیکھ لینا آج کل امام علیہ السلام نظر بند ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہارون نے امام کی گرفتاری کے لیے احکامات صادر کر دیئے۔ پولیس امام علیہ السلام

کے گھر گئی تو آپ وہاں پر موجود نہ تھے۔ پھر وہ مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آئے دیکھا تو آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان ظالموں نے آپ کو نماز مکمل کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ نماز کے دوران امام کو پکڑ کر زبردستی مسجد سے باہر لے آئے۔ اس وقت حضرت نے قبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور عرض کی" السلام علیک یا رسول اللہ السلام علیک یا جداہ" نانا اپنے اسیر و مجبور بیٹے کا سلام قبول فرمائے دیکھ لیا آپ نے کہ آپ کی امت آپ کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے؟

ہارون ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اس لیے کہ اپنے بیٹوں کی ولی عہدی کیلئے لوگوں کو بیعت پر مجبور کرے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام خاموش رہے۔ صبر وتحمل سے کام لیا کسی قسم کا انقلاب برپا کرنے کی بات نہ کی کیونکہ اس وقت کا ماحول بالکل آپ کے خلاف تھا کوئی بھی نہ تھا کہ جو آپ کی حمایت کرتا جو حامی تھے وہ بہت مجبور تھے۔ لیکن آپ کی اسیری کا انداز ظالمانہ نظام حکومت کے خلاف پرزور احتجاج بھی تھا اور آمریت کے منہ پر طمانچہ بھی آپ نے قول وفعل سے ثابت کر دیا ہے کہ ہارون اور اس کے بیٹے غاصب ہیں، مجرم ہیں ملت اسلامیہ کے دشمن ہیں۔

مامون کی باتیں مامون کا طرز زندگی ایسا تھا کہ بہت سے مورخین اس کو شیعہ کہتے اور لکھتے ہیں۔ میرے عقیدہ کے مطابق یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص ایک چیز پر عقیدہ رکھتا ہو لیکن وہ عمل بھی اس پر کرے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شیعہ ہو اور اس کا شمار شیعہ دانشوروں میں سے ہوتا ہو۔ تاریخ میں یہ بھی درج ہے کہ اس نے علماء اہل سنت کے ساتھ متعدد بار مباحثے ومناظرے کیے ہیں۔ میں نے کسی ایسے شیعہ عالم کو نہیں دیکھا جو اس جیسی بہترین گفتگو کرتا ہو۔ چند سال پیش ترکی کے ایک سنی جج کی ایک کتاب چھپی اس کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں مامون کے اہل سنت علماء کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت حقہ کے بارے میں مباحثے،

مناظرے درج کیے گئے ہیں۔ مامون کی عالمانہ، فاضلانہ، دانشمندانہ آراء کو پڑھ کر انسان حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی بحثیں تو بڑے سے بڑا عالم بھی نہ کر سکے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مامون نے ایک مرتبہ کہا ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھ کہ میں نے شیعہ ہونا کس سے سیکھا ہے تو میں کہوں گا کہ میں نے شیعیت کا درس اپنے بابا ہارون سے حاصل کیا ہے۔

کسی نے بالآخر کہہ ہی دیا کہ تمہارے بابا تو شیعہ اور ائمہ شیعہ کا سخت ترین مخالف اور کٹر دشمن تھا، تو اس نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، لیکن میں آپ کو ایک واقعہ سنا تا ہوں وہ یہ کہ میں ایک مرتبہ اپنے بابا کے ہمراہ حج پر گیا اس وقت میں بچہ تھا سب لوگ بابا سے ملنے کیلئے آ جا رہے تھے۔ خاص طور پر علماؤ، مشائخ اور زعمائے ملت کی خلیفہ وقت کے ساتھ خصوصی میٹنگیں تھیں۔ بابا کا حکم تھا کہ جو بھی آئے سب سے پہلے اپنا تعارف خود کروائے، یعنی اپنا نام تمام شجرہ نسب بیان کرے تا کہ خلیفہ کو معلوم ہو کہ یہ قریش سے ہے یا غیر قریش ہے۔ اگر انصار میں سے ہے تو خزرجی قبیلہ سے ہے یا اوسی قبیلہ سے۔ سب سے پہلے نوکر اطلاع کرتا کہ آپ سے فلاں شخص، فلاں کا بیٹا ملنے آیا ہے۔ ایک روز نوکر آیا اس نے بابا سے کہا کہ آپ سے ایک نوجوان ملنے آیا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ موسی ابن جعفر بن محمد بن علی ابن الحسین بن علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ اس نے اتنا ہی کہنا تھا کہ میرا بابا اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا کہ ان سے کہو کہ تشریف لے آئیں۔ پھر بولا کہ ان کو سواری سمیت آنے دیا جائے اور ہمیں حکم دیا کہ اس عظیم القدر شہزادے کا استقبال کیا جائے۔ جب ہم استقبال کیلئے گئے تو دیکھا کہ عبادت وتقوی کے آثار آپ کی پیشانی سے جھلک رہے تھے۔ چہرہ اقدس پر نور ہی نور تھا۔ ان کو دیکھتے ہی ہر انسان بخوبی سمجھ جاتا تھا کہ یہ نوجوان انتہائی پرہیزگار اور متقی شخص ہے۔ بابا نے دور سے زور سے آواز دی کہ آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ سواری سمیت آئیں۔

وہ نوجوان چند قدم سواری سمیت آیا ہم جلدی سے دوڑے اور اس کی رکاب پکڑ کر اس کو نیچے اتارا۔ انہوں نے انتہائی شائستگی ومتانت سے سب کو سلام کیا۔ بابا نے ان کا بہت زیادہ احترام کیا ان کی اور ان کے بچوں کی خیر خیریت دریافت کی۔ پھر پوچھا کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا الحمد للہ میں اور میرے اہل وعیال سب ٹھیک ہیں۔ اور کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ جب وہ جانے لگے تو بابا نے ہم سے کہا جاؤ ان کو گھوڑے پر سوار کراؤ۔

جب میں ان کے قریب گیا تو آہستگی سے مجھ سے کہا کہ تم ایک وقت خلیفہ بنو گے میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ میری اولاد سے برا سلوک نہ کرنا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ واپس آیا مین تمام بھائیوں کی نسبت زیادہ جرات مند تھا۔ موقع پا کر بابا کے پاس آیا اور کہا کہ جس کا آپ اتنا زیادہ احترام کر رہے تھے وہ تھا کون؟ بابا مسکرا کر کہنے لگے بیٹا اگر تو سچ پوچھتا ہے تو جس مسند پر ہم بیٹھے ہیں یہ ان ہی کی تو ہے۔ میں نے کہا کیا آپ جو کہہ رہے ہیں دل سے کہہ رہے ہیں؟ بابا نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا بس خلافت ان کو دے کیوں نہیں دیتے؟ کہا کیا تو نہیں جانتا کہ "الملک عقیم"؟ تو میرا بیٹا ہے اگر مجھے پتا چلے کہ میری حکومت کے خلاف تیرے دل میں فطور پیدا ہوا ہے اور تو میرے خلاف سازش کرنا چاہتا ہے تو تیرا سر قلم کر دوں گا۔ وقت گزرتا رہا ہارون لوگوں کو انعامات سے نوازتا رہا۔ پانچ ہزار سرخ دینار ایک شخص کی طرف اور چار ہزار دینار کسی دوسرے شخص کی طرف۔ میں نے سمجھا کہ بابا جس شخصیت کا حد سے زیادہ احترام کر رہے تھے ان کی طرف بھی زیادہ مقدار میں بھیجیں گے لیکن اس نے ان کی طرف سے سب سے کم رقم ارسال کی یعنی دوسو دینار۔ میں نے وجہ پوچھی تو بابا نے کہا کیا تو نہیں جانتا کہ یہ ہمارے رقیب ہیں سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ہمیشہ تنگدست رہیں۔ ان کے پاس پیسہ نہ ہو کیونکہ اگر ان کے پاس دولت آ گئی تو ممکن ہے ایک لاکھ

تلوار کے ساتھ تمہارے بابا کے خلاف انقلاب برپا کر دیں۔

روحانی اعتبار سے امام علیہ السلام کا اثر و رسوخ

یہاں سے آپ اندازہ لگائیے کہ شیعوں کے آئمہ کا روحانی اثر و رسوخ کس قدر زیادہ تھا۔ وہ نہ تلوار اٹھاتے تھے اور نہ کھلے عام تبلیغ کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی عوام کے دلوں پر حکومت تھی۔ ہارون کی حکومتی مشنری میں ایسے ایسے افراد موجود تھے جو امام علیہ السلام کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ دراصل حق اور سچ ایسی حقیقت ہے جو اندر بلا کی کشش رکھتی ہے۔ آج آپ نے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ اردن کے شاہ حسین نے کہا کہ میں اب سمجھا کہ میرا ڈرائیور میرے مخالفوں کا آلہ کار ہے اور میرا ملک بھی انہی کی سازشوں کی زد میں ہے۔ ادھر علی بن یقطین ہارون الرشید کا وزیر ہے یہ مملکت کا دوسرا ستون ہے۔ لیکن شیعہ ہے۔ تقیہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ ظاہر میں ہارون کا کارندہ ہے لیکن پس پردہ امام امام موسی علیہ السلام کے پاک و پاکیزہ اہداف کی ترجمانی کرتا ہے۔ دو تین مرتبہ علی بن یقطین کے خلاف خلیفہ کو رپوٹ پیش کی گئی لیکن امام علیہ السلام نے اسے قبل از وقت بتا دیا اور اس کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی جس کی وجہ سے علی بن یقطین حاکم وقت کے شر سے محفوظ رہا۔ ہارون کی حکومت میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو امام علیہ السلام کے بیحد عقیدت مند تھے۔ لیکن حالات کی وجہ سے امام علیہ السلام سے رابطہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ اہواز کا رہنے والا ایک ایرانی شیعہ کہتا ہے کہ حکومت وقت نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ ادائیگی کی صورت ہی میں مجھے چھٹکارا مل سکتا تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں میں اہواز کا گورنر معزول ہو گیا۔ نیا گورنر آیا مجھے خوف تھا کہ اس نے آتے ہی مجھ سے ٹیکس کا مطالبہ کرنا ہے۔ میری فائل کھل گئی تو میرا کیا بنے گا؟ لیکن میرے بعض دوستوں نے مجھ سے کہا کہ گھبراؤ نہیں نیا گورنر اندر سے شیعہ ہے اور تم بھی

شیعہ ہو۔ ان کی باتوں کو سن کر مجھے قدرے دلی سکون ہوا۔ لیکن مجھ میں گورنر کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مدینہ جا کر امام موسی کاظم علیہ السلام کا رقعہ لے آؤں (اس وقت آقا گھر پر تھے) میں امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا گوش گزار کیا۔ آپ نے تین چار جملے تحریر فرمائے جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ہمارا حکم ہے کہ اس مرد مومن کی مشکل حل کی جائے۔ آخر میں آپ نے لکھا کہ مومن کی مشکل کو حل کرنا اللہ کے نزدیک بہت ہی پسندیدہ عمل ہے۔ وہ خط لے کر چھپتے چھپاتے اہواز آیا۔ اب مسئلہ خط پہنچانے کا تھا۔ چنانچہ میں رات کی تاریکی میں بڑی احتیاط کے ساتھ گورنر صاحب کے گھر پہنچا۔ دق الباب کیا۔ گورنر کا نوکر باہر آیا میں نے کہا اپنے صاحب سے کہہ دو کہ ایک شخص موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کی طرف سے آپ کو ملنے آیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ گورنر صاحب فوری طور پر خود دروازے پر آ گئے۔ سلام ودعا کے بعد آنے کی وجہ پوچھی میں نے امام علیہ السلام کا خط اس کو دے دیا۔ اس نے خط کو کھول کر اپنی آنکھوں پر لگایا اور آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے گھر میں لے گیا۔ اور مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھ گیا۔ بولا کیا تم امام علیہ السلام کی خدمت اقدس سے ہو کر آئے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں پھر گورنر بولا کیا آپ نے انہیں آنکھوں سے امام علیہ السلام کی زیارت کی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ پھر کہا آپ کی پریشانی کیا ہے؟ میں نے اپنی مجبوری بتائی۔ آپ نے اسی وقت افسروں کو بلایا اور میری فائل کی درستگی کے آرڈر جاری کیے۔ چونکہ امام علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ مومن کو خوش کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے گورنر صاحب جب میرا کام کر چکے تھے تو مجھ سے بولے ذرا ٹھہر جاؤ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میرے پاس جتنا سرمایہ ہے اس کا آدھا حصہ آپ کو دیتا ہوں، میری آدھی رقم اور میرا آدھا سرمایہ آپ کا

ہے۔ وہ مومن روایت کرتا ہے کہ ایک تو میری بہت بڑی مشکل حل ہو چکی تھی دوسرا گورنر صاحب نے مجھے امام علیہ السلام کی برکت سے مالا مال کر دیا تھا۔ میں گورنر کو دعائیں دیتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ ایک سفر پہ میں امام علیہ السلام کی خدمت اقدس میں گیا تو سارا ماجرہ عرض کیا آپ علیہ السلام سن کر مسکرا دیئے اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہارون کو ڈر کس چیز سے تھا؟ جواب صاف ظاہر ہے وہ حق کی جاذبیت اور کشش سے خوف زدہ تھا:

"کونوا دعاۃ الناس بغیر السنتکم"

"یعنی آپ لوگ کچھ کہے بغیر لوگوں کو حق کی دعوت دیں۔ زبان کی باتوں میں اثر اکثر کم ہی ہوتا ہے۔ اثر و تاثیر تو عمل ہی سے ہے۔"

وہ شخص جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام یا آپ کے اباؤ اجداد اور اولاد کا نزدیک سے مشاہدہ کر چکا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب حق پر ہیں اور حق ان کے ساتھ ہے۔ یہ پاک و پاکیزہ ہستیاں خدا کی حقیقی معرفت رکھتے ہیں۔ اور خوف خدا صحیح معنوں میں انہی میں ہے۔ یہ خدا سے صحیح محبت کرنے والے ہیں، اور جو کچھ بھی کرتے ہیں اسی میں خدا کی رضا ضرور شامل حال ہوتی ہے۔

ایک جیسی عادتیں

دو عادتیں ایسی ہیں جو تمام آئمہ طاہرین علیہم السلام میں مشترک ہیں۔ عبادت اور خدا خوفی کا جذبہ۔ ۔ ۔ یہ ہستیاں خدا کو اس طرح مانتی ہیں جیسا کہ ماننا چاہیے۔ خدا خوفی ایسی کہ نام الٰہی زبان پر آنے یا سننے سے ان کا جسم کانپ اٹھتا تھا یوں محسوس ہوتا ہتا جیسا کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہوں۔ جنت و جہنم کے مناظر آنکھوں کے سامنے ہوں؟ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں تاریخ میں ملتا ہے۔

"حلیف السجدۃ الطویلۃ والدموع الغزیرۃ" [۲۹]

"طویل سجدوں اور تیزی کے ساتھ بہنے والے آنسوؤں کے مالک امام۔"

جب انسان کا دل اندر سے جوش مارتا ہے تو تب اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی دوسری مشترک صفت اور عادت یہ ہے کہ تمام آئمہ طاہرین علیہم السلام غریبوں سے محبت کرتے ان کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آتے اور غریبوں، بے نواؤں کی فوری اور ہر طرح کی مدد کرتے تھے۔ امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، امام زین العابدین علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السلام، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام، اور دیگر آئمہ سیرت و کردار کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ جب ہم ان کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں مظلوموں، بے کسوں، یتیموں، اور فقراء کی مدد کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ظاہری سی بات ہے یہ بے سہارا لوگ ان کو دیکھتے بھی ہوں گے۔ ان کے عمل نے ان کو وہاں تک پہنچا دیا جہاں کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔

ہارون کی حکومتی مشینری

امام علیہ السلام ایک عرصہ سے زندان سے مظلومانہ زندگی گزار رہے تھے کہ ہارون نے سازش تیار کی کہ امام علیہ السلام کی حیثیت اور عزت کم کی جائے۔

ایک خوبصورت کنیز کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ زندان میں امام علیہ السلام کے ساتھ رہے اور کھانا پینا آپ کی خدمت میں پیش کرتی رہے۔ انہوں نے انتہائی حسین عورت کو اس لیے ڈیوٹی پر متعین کیا کہ امام ایک قیدی ہیں اور مرد ہونے کی وجہ سے ان کی خوابیدہ خواہشات بیدار ہوں گی اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں گے کہ ہم ان کو گناہ میں ملوث کر لیں گے۔ ہارون اور اس کے کارندوں کی غلط فہمی تھی لیکن ادھر کیا ہوا یہ کنیز

جب تنگ و تاریک کمرہ میں گئی تو اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب برپا ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنا سر سجدہ میں رکھ دیا اور عبادت میں مشغول ہو گئی۔ جاسوسوں نے ہارون کو خبر دی کہ کنیز بھی عبادت کرنے لگی ہے۔ ہارون نے اس کو اپنے دربار میں بلوایا دیکھا وہ تو وہ نہ رہی، کبھی آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی زمین کی طرف۔ پوچھا گیا اے کنیز تو نے اپنا یہ حال کیوں بنایا ہے؟ کہنے لگی میں تو گناہ کی غرض سے گئی تھی جب تقویٰ اور پرہیز گاری کے عظیم پیکر کو دیکھا تو مجھ میں احساس شرمندگی پیدا ہوا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ قیدی کس طرح عبادت الٰہی میں منہمک ہے۔ میں اپنی اس غلطی پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی ہوں۔ اللہ میرے دوسرے گناہ بھی بخش دے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ وہیں پر انتقال کر گئی۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور بشر حافی

آپ نے بشر حافی کا واقعہ سنا ہے کہ ایک روز امام علیہ السلام بغداد کے ایک کوچے سے گزر رہے تھے۔ اچانک آپ کو رقص وسرود اور ناچ گانے کی آواز سنائی دی۔ اتفاق سے اسی گھر سے ایک نوکرانی باہر نکلی کہ گھر کا کوڑا کرکٹ ایک جگہ پر پھینکنے۔ آپ نے اس کنیز سے فرمایا کہ کیا یہ گھر کسی آزاد شخص کا ہے یا کسی غلام کا؟ سوال بڑا عجیب تھا وہ کنیز بولی آپ مکان کی ظاہری خوبصورتی اور زیبائش و آسائش کو نہیں دیکھ رہے کہ یہ کس شخص کا گھر ہو سکتا ہے۔ یہ گھر بشر حافی کا ہے۔ بغداد کا امیر ترین یہ شخص۔۔۔۔۔ ۔۔۔ یہ سن کر فرمایا ہاں یہ گھر کسی آزاد ہی کا ہے۔ اگر بندہ ہوتا تو اس کے گھر سے موسیقی، راگ رنگ کی آوازیں بلند نہ ہوتی؟ عجیب تاثیر تھی امام کے جملوں میں۔۔۔ ۔۔۔۔۔ جب وہ نوکرانی کوڑا ڈال کر واپس اپنے مالک کے گھر گئی تو اس نے نوکرانی سے تاخیر کی وجہ پوچھی، تو اس نے کہا کہ ایک شخص نے مجھ سے عجیب وغریب بات کہی

ہے۔ بشر بولا وہ کیا؟ بولی کہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ گھر کسی آزاد کا ہے یا غلام کا۔۔ ۔۔۔۔۔ میں نے کہا آزاد کا ہی گھر ہے۔ اس شخص نے کہاں ہاں واقعی وہ آزاد ہے۔ اگر بندہ ہوتا تو رقص وسرود کی آوازیں اس کے گھر سے بلند نہ ہوتیں۔ بشر نے پوچھا اس شخص کی کوئی خاص نشانی؟ کنیز نے جب اس کی وضع قطع بتائی تو سمجھا کہ آپ موسیٰ بن جعفر علیہ السلام ہی تھے۔

بشر نے پوچھا پھر وہ شخص کہاں گیا؟ اس نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ بزرگ اس طرف جا رہے تھے۔ چونکہ وقت کم تھا اگر جوتا پہنتا تو شاید امام علیہ السلام آگے جا چکے ہوتے۔ لہذا وہ پابرہنہ امام علیہ السلام کے پیچھے دوڑ پڑا۔ آقا کے اس جملے نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ کہ اگر وہ بندہ ہوتا تو اس قسم کا گناہ نہ کرتا۔ یہ ہانپتا کانپتا امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ مولا علیہ السلام آپ نے جو کچھ فرمایا سچ فرمایا ہے۔ میں اپنی غلطی پر خدا سے توبہ کرتا ہوں اور واقعی طور پر اس کا بندہ بننا چاہتا ہوں۔ امام علیہ السلام نے اس کے حق میں دعا کی اور وہ توبہ تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کے صالح ترین بندوں میں شامل ہو گیا۔ جب اس طرح کی خبریں ہارون الرشید تک پہنچیں تو وہ اپنے اندر احساس خطر کرنے لگا۔ دل ہی دل میں کہا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے گویا وہ کہہ رہا تھا کہ "وجودک ذنب" کہ اے موسیٰ ابن جعفر آپ کا زندہ رہنا میرے نزدیک گناہ ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا میں نے تمہارے کیا بگاڑا؟ میں نے کونسا انقلاب برپا کیا ہے؟ میں نے ایسا کونسا کام کیا ہے کہ تم مجھ سے گھبراتے ہو؟ ہارون جواب نہ دے سکا لیکن دل میں کہہ رہا تھا کہ آپ کا موجود رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ امام علیہ السلام یہ باتیں اپنے تحفظ اور دفاع کی خاطر کرتے تا کہ مومنین ہوشیار رہیں اور حکومتی ہتھکنڈوں میں پھنس کر اپنا نقصان نہ کر بیٹھیں۔ ہارون کو ہر وقت آپ سے اور آپ کے ماننے والوں سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے وہ امام اور ان کے چند خاص موالیوں کے خاتمہ کیلئے مشیروں

سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔

صفوان جمال اور ہارون

آپ نے صفوان کا واقعہ سنا ہے؟ یہ شخص اس دور میں اونٹ کرائے پر دیتا تھا۔اس زمانے میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی سواری اونٹ ہی ہوا کرتا تھا۔ صفوان کا حکومت وقت کے ساتھ بھی اچھا رابطہ تھا۔کبھی کبھار سرکاری ڈیوٹی کے لیے بھی حکومت کو اونٹ مہیا کرتا تھا۔ایک روز ہارون نے پروگرام بنایا کہ مکہ جائے۔ چنانچہ اس نے صفوان کو بلوایا کہ وہ اس کے لیے چند اونٹ تیار کرلے کرایہ وغیرہ طے پا گیا۔ صفوان امام موسی کاظم علیہ السلام کے خاص شیعوں میں تھا۔ ایک روز امام علیہ السلام کی خدمت اقدس مین حاضر ہوا اس نے آتے ہی امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ مولا علیہ السلام میں نے ہارون کو اونٹ کرائے پر دیئے ہیں۔حضرت نے فرمایا تو نے اس ظالم،ستم گر شخص کو اونٹ کیوں دیئے ہیں۔صفوان بولا مولا علیہ السلام میں تو اس سے کرایہ لیا ہے، پھر اس کا سفر کوئی گناہ کی غرض سے نہ تھا بلکہ سفر حج کیلئے ہے۔اگر وہ حج پر نہ جاتا تو میں اونٹ اس کو کرائے پر نہ دیتا۔فرمایا تو نے اس سے پیسے لے لیے ہیں؟ یا اس رقم کا بقایا رہتا ہے؟ اپنے دل سے سوال کر، میں نے اونٹ اس کو کرائے پر دیئے ہیں اس لیے دیئے ہیں کہ ہارون واپس لوٹے گا اور میں اس سے کرایہ لوں گا۔صفوان بولا جی ہاں مولا ایسا ہی ہے آپ نے فرمایا ظالم کی زندگی پر راضی رہنا بھی گناہ ہے۔صفوان باہر آیا۔ ہارون سے دیرینہ تعلقات کے باوجود اس نے اپنے تمام اونٹ بیچ دیئے اور اعلان کیا کہ آئندہ وہ یہ کاروبار بالکل نہیں کرے گا۔اس کے بعد ہارون کے پاس آیا کہ میں نے جو آپ سے معاہدہ کیا تھا وہ منسوخ کرتا ہوں کیونکہ میں نے مجبوری کی وجہ سے اپنے تمام اونٹ فروخت کر دیئے ہیں۔ ہارون نے پوچھا پھر بھی بتائے کہ اونٹ بیچنے کی وجہ

کیا ہے؟ صفوان بولا اے بادشاہ سلامت میں بوڑھا ہو چکا ہوں اب اس طرح کا کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

ہارون بڑا چالاک شخص تھا اس نے کہا ایسا نہیں ہے کہ جو تم کہہ رہے ہو دراصل تجھے موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام نے منع کر دیا ہے۔اور انھوں نے اس کام کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے اونٹ بیچنے کی تلقین کی ہے۔ بخدا اگر تمہارے اور ہمارے درمیان پرانی دوستی نہ ہوتی تو تجھے ابھی اور اسی وقت قتل کر دیتا۔ یہ تھے وہ عوامل جو امام علیہ السلام کی شہادت کا سبب بنے۔سب سے پہلے تو دشمن کو آپ کے وجود سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ دوسرا آپ تقیہ کی حالت میں زندگی گزارتے رہے،یعنی آپ نے اس انداز سے اپنا طور طریقہ رکھا کہ آپ کا دشمن کسی لحاظ سے بھی آپ کو نقصان نہ پہنچا سکا۔اس کے باوجود آپ تبلیغی فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔لوگوں کی روحانی و علمی ضروریات پوری کرتے، پسماندہ طبقے کے حقوق کے لیے بھرپور طریقے سے آواز بلند کرتے تھے۔لیکن آپ نے اس تمام مدت دشمن کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ دیا۔

وہ اپنے جاسوسوں،گماشتوں کے ذریعے اس کوکشش میں رہا کہ امام علیہ السلام پر کوئی نہ کوئی سیاسی یا مذہبی جرم عائد کر کے ان کو سزا دے سکے۔تیسرا آپ استقامت کا کوہ گراں تھے۔ جب یحییٰ برمکی نے آپ سے کہا کہ آپ ایک مرتبہ ہارون سے معافی مانگ لیجئے تو آپ کو نہ صرف رہائی مل سکتی ہے بلکہ وافر مقدار میں انعام واکرام بھی ملے گا۔آپ نے فرمایا اس زندگی سے مرجانا بہتر ہے اور ہم بہت جلد اس فانی دنیا سے کوچ ہی کرنے والے ہیں۔

ایک دفعہ ہارون نے کسی دوسرے شخص کو امام کے پاس زندان میں بھیجا اور چاہا کہ پیار ومحبت سے امام علیہ السلام سے گناہ کا اعتراف کروایا جائے۔ پھر بھی اس نے یہ لب ولہجہ اپنایا کہ ہم آپ سے دلی عقیدت رکھتے ہیں۔آپ کا دل و جان سے احترام

کرتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ یہیں پہ رہیں اور مدینہ نہ جائیں۔ ہم آپ کو زندان میں رکھنا نہیں چاہتے۔ ہم آپ کو اپنے پاس ایک محفوظ مکان میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے آپ کے پاس ایک ماہر باورچی بھیجا ہے تاکہ آپ اپنی پسند کا کھانا تیار کرواسکیں۔ یہ تھا فضل بن ربیع۔ ہارون کو اس پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہی فضل سادہ لباس میں تلوار اپنے ساتھ حمائل کر کے امام کے پاس پہنچا۔ امام علیہ السلام نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔

امام علیہ السلام کو جب پتہ چلا کہ فضل بن ربیع آیا ہے۔ فضل اس انتظار میں تھا کہ آپ نماز کو ختم کریں اور میں آپ کو خلیفہ کا پیغام پہنچاؤں۔ آپ نے نماز ختم کرتے ہی دوبارہ اور نماز شروع کر دی۔ اس طرح اس کو سلام کرنے اور بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ امام علیہ السلام نے چند نمازیں پڑھنی ہیں لیکن پھر اس کو پتہ چلا کہ آپ اس سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ اس لیے وہ نماز پہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ کافی انتظار کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں خیال گزرا کہ ہارون کے ذہن میں بدگمانی نہ ہو۔ امام نماز میں مشغول تھے کہ اس نے بات شروع کر دی کہ آپ کے چچازاد بھائی ہارون نے آپ کو اس طرح پیغام بھیجا ہے۔ ہارون نے پیغام میں کہا ہے کہ ہم پر آپ کی بے گناہی ثابت ہو چکی ہے۔ اسلئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ مدینہ جانے کی بجائے یہیں پہ رہیں۔ مجھے ہارون کی طرف سے حکم ملا ہے کہ بہترین باورچی آپ کی خدمت میں پیش کروں تاکہ حسب خواہش آپ اپنا کھانا تیار کرواسکیں۔

مؤرخین نے لکھا ہے امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ کر دوبارہ نماز شروع کر لی:

"لا حاضر لی مال فینفصنی وما خلقت سؤولا، اللہ اکبر"

میرے پاس اپنا مال نہیں ہے کہ خرچ کرسکوں میں مال حلال سے کچھ کھاتا

پیتا ہوں باقی رہی کسی سے مانگنے کی بات تو مانگنا تو ہم نے اپنی زندگی میں سیکھا ہی نہیں ہے۔ بھلا دینے والے مانگنا گوارا کب کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد کہا اللہ اکبر اور نماز شروع کر لی۔"

یہ تھا خلفاء کا ہمارے اماموں کے ساتھ رویے، وہ کسی نہ کسی طریقے سے آئمہ کو مجبور کرتے رہتے تھے، لیکن آئمہ طاہرین علیہم السلام کی حسن سیاست اور تدبر کا کیا کہنا کہ دنیا کے طاقتور ترین حکمران ان کی استقامت کے مقابلے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ آئمہ کے وجود کو اس لیے برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان کا وجود ہی ظالموں کی موت ہے اس لیے وہ تلوار کے ذریعہ یا زہر دے کر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خاص نشانیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے عملی طور پر اس قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے، لیکن حق کی سچائی اور فتح ملاحظہ کیجئے کہ وہ قتل کر کے آرام سے نہیں رہ سکتے تھے اور یہ مر کر بھی امر ہو جاتے تھے۔

شہادت امام علیہ السلام

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ امام علیہ السلام کے لیے آخری زندان سندی بن شاہک کا تھا۔ وہ مسلمان نہ تھا اس کے دل میں کسی کے بارے میں کسی قسم کا رحم نہ تھا۔ خلیفہ اس کو جو بھی حکم دیتا وہ فوری طور پر بجالاتا تھا۔ امام علیہ السلام کو تنگ وتاریک کمرہ میں رکھا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ آپ اس کمرے کی وحشت ناکی سے گھبرا کر اور بیماری سے نڈھال ہو کر یونہی انتقال کر جائیں گے۔ اس سے عوام میں حکومت کے خلاف رد عمل ظاہر نہ ہوگا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یحییٰ برمکی نے ہارون سے کہا کہ امام علیہ السلام کو قتل کرنے کا کام وہ خود ہی کرے گا۔ اس نے سندی کو بلوایا اور اس کو مزید انعام واکرام اور اعلیٰ عہدے کی لالچ دی اور اس کو حکم دیا کہ وہ امام علیہ السلام کا کام تمام کر دے۔ یحییٰ

نے انتہائی خطرناک زہر منگوا کر سندی کو دیا وہ زہر کھجور میں رکھ کر امام علیہ السلام کو کھلایا۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے چند سرکاری گواہ منگوائے اور چند علماء اور قاضیوں کو بلوایا گیا۔حضرت کو اس میٹنگ میں لایا گیا۔ ہارون نے کہا لوگو! گواہ رہنا شیعہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں طرح طرح کے پروپیگنڈے کرتے ہیں اور ان کا کہنا کہ امام علیہ السلام زندان میں سخت تکلیف میں ہیں آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ وہ تندرست وصحیح وسالم ہیں۔ ہارون کی بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ قیدی امام علیہ السلام بول پڑے فرمایا ہارون جھوٹ کہتا ہے مجھے ابھی ابھی زہر دیا گیا اور میں چند لمحوں کا مہمان ہوں۔۔۔۔ یہاں پر بھی ان عیارترین حکمرانوں کا منصوبہ بھی پورا نہ ہوسکا۔

پھر کیا ہوا بغداد کا قیدی اور شیعوں ومومنوں کا ساتواں امام شہید ہوگیا۔ شہادت کے بعد غریب بغداد کا جنازہ پل بغداد پر رکھا گیا۔لوگوں میں پھر پروپیگنڈا کیا گیا کہ دیکھو تو سہی امام کا کوئی عضو متاثر نہیں ہوا ہے۔سر اور زبان سلامت ہے۔ یہ اپنی موت آپ مرے ہیں، ان کی وفات میں ہمارا کسی قسم کا ہاتھ نہیں ہے۔ تین دن تک اس پردیسی اور مظلوم ومسموم امام کا جنازہ بغداد کے پل پر پڑا رہا۔ اس سے صرف لوگوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ قتل امام علیہ السلام میں حکومت کا ہاتھ نہیں ہے۔لیکن امام علیہ السلام کے ماننے والے (جو اس وقت سخت کرب اور پریشانی میں مبتلا تھے) جانتے تھے۔امام علیہ السلام کو زہر ہی کے ذریعہ شہید کردیا گیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایران سے چند مومنین بغداد آئے ان کی دلی خواہش تھے کہ امام علیہ السلام کی زندان میں ملاقات کریں گے۔انہوں نے داروغہ جیل سے ملاقات کی اجازت چاہی تو اس نے انکار کردیا۔انہوں نے عہد کرلیا کہ وہ ہر حال میں اپنے غریب ومظلوم آقا سے مل کر جائیں گے۔حکام نے ان کے پاس چند سپاہی بھیجے کہا کہ آپ کی درخواست منظور کرلی گئی۔آپ فلاں جگہ پر انتظار کریں۔آپ کو اپنے امام

علیہ السلام سے ملایا جائے گا۔ یہ بیچارے اس انتظار میں کھڑے رہے اور دل ہی دل میں کہنے لگے جب ہم واپس اپنے وطن لوٹیں گے تو وہاں لوگوں کو امام علیہ السلام کی زیارت کے بارے میں بتائیں گے پھر ہم اپنے آقا سے شرعی مسائل بھی دریافت کریں گے۔ابھی یہ اس طرح کی باتیں آپس میں کر ہی رہے تھے کہ دیکھا چار مزدوروں نے ایک جنازہ اٹھایا ہوا ہے ہمیں جیل کا ایک ملازم کہنے لگا۔" امام شما ہمین است" کہ آپ نے جس امام سے ملنا ہے وہ یہی ہے۔ یہ جنازہ تمہارے بیکس امام ہی کا ہے۔ یہ ایرانی مومنین اپنا منہ پیٹتے رہ گئے۔۔۔۔۔۔۔غریب بغداد کا جنازہ آگے سے گزر گیا۔

مسئلہ ولی عہدی امام رضا علیہ السلام

آج ہماری بحث کا مرکز انتہائی اہم مسئلہ ہے وہ ہے مسئلہ امامت و خلافت۔ اس کو ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کی طرف لے آتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ مسئلہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مامون امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے سرزمین خراسان "مرو" میں لے آیا اور آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ یا ولی عہد دونوں لفظوں کا معنی ومفہوم ایک ہی ہے۔ یہ اس دور کی اصطلاح میں استعمال ہوتا تھا۔ میں نے چند سال قبل اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ یہ کلمہ کس تاریخ کی پیداوار ہے۔ صدر اسلام میں تو تھا ہی نہیں۔ جب موضوع ہی نہ تھا تو پھر لغت کیسی؟ پھر یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ اس قسم کی اصطلاح آنے والے زمانوں میں استعمال میں لائی گئی۔ سب سے پہلے امیر شام نے اس اصطلاح کو اپنے بیٹے یزید کے لئے استعمال کیا، لیکن اس نے اس کا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا، بلکہ اس نے یزید کے لیے بیعت کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس لیے ہم اس لفظ کو اس دور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ امام حسن علیہ السلام کی صلح کے وقت بھی یہ لفظ زیر بحث آیا۔ تاریخ کہتی ہے کہ امام علیہ السلام نے خلافت امیر شام کے حوالے کر دی اور امام علیہ السلام کے نزدیک حاکم وقت کو اپنے حال پہ رہنے دینا ہی وقت کا اہم تقاضا تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اعتراض کریں کہ اگر امام حسن علیہ السلام نے ایسا کیا ہے تو دوسرے آئمہ کو بھی کرنا چاہیے تھا ایک امام کا اقدام صحیح ہے اور دوسروں کا نہیں؟

امام حسن علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام کو حکام وقت کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں پرچم جہاد بلند کرتے ہوئے شہید ہو جاتے تو بہتر تھا؟ اب ہم نے انہی اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ تاکہ بدگمانیوں کا خاتمہ ہو اور لوگوں کو حقائق

کے بارے میں پتہ چل سکے۔ امام حسن علیہ السلام کی صلح کے بارے میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب ہم امام رضا علیہ السلام کے دور امامت میں پیش آنے والے تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں تجزیہ کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ امام رضا علیہ السلام نے مامون کی ولی عہدی قبول فرمائی؟

علویوں کے ساتھ عباسیوں کا رویہ

مامون عباسی سلطنت کا وارث ہے۔ عباسیوں نے شروع ہی میں علویوں کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ بہت سے علوی عباسیوں کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے۔ اقتدار کے حصول کے لیے جتنا ظلم عباسیوں نے علویوں پر کیا اور امویوں سے کسی صورت میں کم نہ تھا بلکہ ایک لحاظ سے زیادہ تھا۔ چونکہ اموی خاندان پر واقعہ کربلا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس لیے امویوں کو ظالم ترین تصور کیا جاتا ہے۔ عباسیوں نے جتنا ظلم علویوں پر کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر بہت زیادہ تھا، دوسرے عباسی خلیفہ نے شروع شروع میں اولاد امام حسین علیہ السلام پر بیعت کے بہانے سے حد سے زیادہ مظالم کئے۔ بہت سے سادات کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ کچھ زندانوں میں قید و بندی کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ان بیچاروں کو کھانے پینے کے لئے نہیں دیا جاتا تھا۔ بعض سادات پر چھتیں گرا کر ان کو شہید کیا جاتا تھا۔ وہ کونسا ظلم تھا جو عباسیوں نے سادات پر روا نہ رکھا۔ منصور کے بعد جو بھی خلیفہ آیا اس نے اس پالیسی پر عمل کیا۔ مامون کے دور میں پانچ چھ سیدزادوں نے انقلابی تحریکیں شروع کیں۔ ان کو مروج الذہب، مسعودی، کامل ابن اثیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ کی بعض کتب میں تو سات آٹھ انقلابی شہزادوں کا ذکر ملتا ہے۔

عباسیوں اور علویوں کے درمیان دشمنی بغض و کینہ کی حد تک چلی گئی تھی۔

کرسی خلافت کے حصول کیلئے عباسیوں نے ظلم کی انتہا کر دی، یہاں تک کہ اگر عباسی خاندان کا کوئی فرد عباسی خلافت کا مخالف ہو جاتا تو اس کو بھی فوراً قتل کر دیا جاتا۔ ابو مسلم عمر بھر عباسیوں کے ساتھ وفاداریوں کا حق نبھاتا رہا لیکن جونہی اس کے بارے میں خطرے کا احساس کیا تو اسی وقت اس کا کام تمام کر دیا۔ برمکی خاندان نے ہارون کے ساتھ وفا کی انتہا کر دی تھی۔ انہوں نے اس کی خاطر غلط سے غلط کام بھی کئے اور ان دونوں خاندانوں کی دوستی تاریخ میں ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ایک چھوٹے سے سیاسی مسئلہ کی وجہ سے اس نے یحییٰ کو مروا دیا اور اس کے خاندان کو چین سے رہنے نہ دیا تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا یہی مامون اپنے بھائی امین کے ساتھ الجھ پڑا۔ سیاسی اختلاف اتنا بڑھا کہ نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ بالآخر مامون کامیاب ہو گیا اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔

بدلتا رنگ ہے آسمان کیسے کیسے۔

پھر حالات نے رخ بدلا، بہت تبدیلی آئی، ایسی تبدیلی کہ جس پر مورخین بھی حیران ہیں۔ مامون خلیفہ امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے بلواتا ہے۔ حضرت کے نام پیغام بھجواتا ہے کہ آپ خلافت مجھ سے لے لیں۔ جب آپ تشریف لاتے ہیں تو کہتا ہے کہ بہتر ہے آپ ولی عہدی ہی قبول فرمائیں اگر نہ کیا تو آپ کے ساتھ یہ یہ سلوک کیا جائے گا۔ معاملہ دھمکیوں تک جا پہنچا۔ یہ مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے کہ جس آسانی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، بہت ہی مشکل حالات تھے۔ امام علیہ السلام ہی بہتر جانتے تھے کہ کونسی حکمت عملی اپنائی جائے۔

جرجی زیدان تاریخ تمدن کی چوتھی جلد میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ اس کے بارے میں میں بھی تفصیلی بات چیت کروں گا۔ جرجی زید

ایک بات کا اعتراف ضرور کرتا ہے کہ بنی عباس کی سیاست بھی انتہائی منافقانہ اور خفیہ طرز کی سیاست تھی۔ وہ اپنے قریبی ترین عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی سیاسی داؤ پیچ پوشیدہ رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر آج تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ مامون امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنا کر کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ وہ آل محمدؐ کے ایک ایسے فرد کو اپنا نائب مقرر کر رہا تھا کہ جو وقت کا امام علیہ السلام بھی تھا اور یہ دل ہی دل میں خاندان رسالت علیہ السلام کے ساتھ سخت دشمنی رکھتا تھا؟

امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی اور تاریخی حقائق

امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا مسئلہ راز رہے یا نہ رہے لیکن ملت جعفریہ کے نزدیک اس مسئلے کی حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ ہمارے اس موقف کی صداقت کے لیے شیعہ مورخین کی روایات ہی کافی ہیں جیسا کہ جناب شیخ مفید (رح) نے اپنی کتاب ارشاد، جناب شیخ صدوق نے اپنی کتاب عیون اخبار الرضا میں نقل کیا ہے۔ خاص طور پر عیون میں امام رضا علیہ السلام ہی کی ولی عہدی کے بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ قبل اس کے ہم شیعہ کتب سے کچھ مطالب بیان کریں۔ اہلسنت کے ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین سے دلچسپ تاریخی نکات نقل کرتے ہے، ابوالفرج اپنے عہد کا بہت بڑا مورخ ہے یہ اموی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے یہ آل بابویہ کے زمانے میں زندگی بسر کرتا رہا۔ چونکہ یہ اصفہان کا رہنے والا ہے اس لیے اس کو اصفہانی کہا جاتا ہے۔ ابوالفرج سنی المذہب ہے۔ شیعوں سے اس کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کو شیعوں سے کسی قسم کی ہمدردی تھی۔ پھر یہ شخص کچھ اتنا زیادہ نیک بھی نہ تھا کہ کہیں کہ اس نے تقویٰ اور پرہیز گاری کو سامنے رکھتے ہوئے حقائق کو بیان کیا ہے۔ مشہور کتاب الآغانی کا مصنف بھی

یہی ابوالفرج اصفہانی ہی ہے۔ الآغانی اغنیۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے آوازیں۔

اس کتاب میں موسیقی کے بارے میں مکمل تعارف، کوائف اور تاریخ تحقیقی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب موسیقی کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالفرج کا ایک ہم عصر عالم صاحب بن عباد سفر پر کہیں بھی جاتا تھا۔ ابوالفرج کی چند کتابیں اس کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ابوالفرج کی کتابوں کے ہوتے ہوئے اب مجھے دوسری کتابوں کی ضرورت نہ رہی۔ الآغانی اس قدر جامع اور تحقیقی کتاب ہے کہ اس کو پڑھ کر کسی دوسری کتاب کی احتیاج نہیں رہتی۔ یہ موضوع کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ اس میں موسیقی اور موسیقی کاروں کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ مجلسی (رح)، الحاج شیخ عباس قمی (رح)، نے بھی الآغانی کو الفرج کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ ابوالفرج کی ایک کتاب مقاتل الطالبین ہے (جو کہ کافی مشہور ہے) اس میں انہوں نے اولاد ابی طالب کے مقتولوں ک تاریخ بیان کی ہے۔ اس میں اولاد ابی طالب کی انقلابی تحریکوں اور ان کی المناک شہادتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شہادت کے اس باب میں علوی سادات کی اکثریت ہے۔ البتہ کچھ غیر علوی بھی شہید ہوئے ہیں۔ اس نے کتاب کے دس صفحے امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے ساتھ خاص کیے ہیں۔ اس کتاب کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ تو دیکھتے ہیں کہ اس کے مطالب اور شیعہ قلمکاروں کی تحریریں اس موضوع کی بابت تقریباً ایک جیسی ہیں۔

آپ ارشاد کا مطالعہ کر لیں اور مقاتل الطالبین کو پڑھ لیں ان دونوں کتابوں میں آپ کو کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوگا۔ اس لیے ہم شیعہ سنی حوالوں سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے لیکن اس سے قبل ہم آتے ہیں مامون کی طرف وہ کونسا عامل

تھا کہ جس کی وجہ سے وہ امام رضا علیہ السلام کو ولی عہدی بنانے پر تیار ہوا؟ اگر تو اس نے یہ سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرجائے یا قتل ہوجائے تو جانے سے پہلے خلافت امام رضا علیہ السلام کے سپرد کر جائے۔ ہم اس کو اس لیے نہیں مانیں گے کہ اگر اس کی امام علیہ السلام کے بارے میں اچھی نیت ہوتی تو وہ ان کو زہر دے کر شہید نہ کرتا۔ شیعوں کے نزدیک اس قول کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ مامون امام کے بارے میں اچھی نیت رکھتا تھا، بعض مورخین نے مامون کو شیعہ کے طور پر تسلیم کیا ہے کہ وہ آل علی علیہ السلام کا بیحد احترام کرتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ واقعی ہی مخلص، مومن تھا تو اپنی خلافت سے دست بردار ہو کر اس نے مسند خلافت امام علیہ السلام کے سپرد کیوں نہ کر دی؟ اگر وہ سادات کا محبّ تھا تو امام علیہ السلام کو زہر کیوں دی؟

مامون اور تشیع

مامون ایک ایسا حکمران ہے کہ جس کو ہم خلفاء سے بڑھ کر بلکہ پوری دنیا کے حکمران سے بڑھ کر عالم، دانشور مانتے ہیں۔ وہ اپنے دور کا نابغہ انسان تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ وہ فکری ونظریاتی لحاظ سے مذہب شیعہ سے زیادہ متاثر تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ امام علیہ السلام کے علمی لیکچرز میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرتا تھا۔ وہ سنی علماء کے دروس میں بھی جاتا تھا۔ اہل سنت کے ایک معروف عالم ابن عبدالبر بیان کرتے ہیں کہ ایک روز مامون نے چالیس سنی علماء کو ناشتے پر بلایا اور ان کو بحث و مباحثہ کی بھی دعوت دی۔۔۔۔۔ آقائے محمد تقی شریعتی نے اپنے کتاب خلافت و ولایت میں نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس خوبصورتی کے ساتھ مامون نے مسئلہ خلافت پر دلائل دیئے ہیں اتنے کسی اور عالم نے نہیں دیئے ہوں گے۔ مامون نے علماء کے ساتھ خلافت امیر المومنین پر بحث مباحثہ کیا اور سب کو مغلوب کر دیا۔

شیعہ روایات میں آیا ہے اور جناب شیخ عباس قمی (رح) نے بھی اپنی کتاب منتہی الآمال میں لکھا ہے کہ کسی نے مامون سے پوچھا کہ آپ نے شیعہ تعلیمات کس سے حاصل کی ہیں؟ کہنے لگا والد ہارون سے۔۔۔۔۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ھارون بھی مذہب شیعہ کو اچھا اور برحق مذہب سمجھتا تھا۔ وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ ایک خاص قسم کی عقیدت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے بابا سے کہا کرتا تھا کہ ایک طرف آپ امام علیہ السلام سے محبت کا دم بھرتے ہیں اور دوسرے طرف ان کو روحانی و جسمانی اذیتیں بھی دیتے ہیں؟ تو وہ کہا کرتا تھا "الملک عقیم" عرب میں ایک ضرب المثل ہے کہ اقتدار بیٹے کو نہیں پہچانتا، تو اگر چہ میرا بیٹا ہے لیکن میں یہ ہرگز برداشت نہ کروں گا کہ تو میری حکومت کے خلاف ذرا بھر اقدام کرے۔ حکومت، کرسی اور اقتدار کی خاطر میں تیرا سر قلم کرسکتا ہوں۔ مامون آئمہ کا دشمن تھا اس لیے اس کو شیعہ کہنا زیادتی ہوگی، یا پھر وہ کوفہ والوں کی مانند بے وفا تھا جو امام حسین علیہ السلام کو دعوت دے کر اپنا عہد توڑ بیٹھے اور یزیدی قوتوں کے ساتھ مل گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ماموں ظالم تھا لیکن اس علم کا کیا فائدہ جو اسے استاد کی تعظیم کا درس بھی نہ دے۔ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ ماموں نے خلوص نیت سے امام رضا علیہ السلام کو حکومت کی دعوت دی تھی اور امام علیہ السلام کی موت طبعی تھی۔ لیکن ہم شیعہ اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے مصلحت وقت کے مطابق آپ نے ولی عہدی کو قبول فرمایا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ امام علیہ السلام مامون کی حکومت کو حق مانتے اور جانتے ہوں امام علیہ السلام ایک روز بھی مسند حکومت پر نہیں بیٹھے۔ یونہی وقت ملا آپ علوم اسلامی کی ترویج کرتے، غریبوں اور بے نواؤں کی خدمت کرتے۔ رہی بات مامون کی تو حکومت اور اقتدار کے بھوکے یہ خلیفے کسی سے مخلص نہ تھے۔ انہوں نے سیاسی مفادات کی خاطر بڑے بڑے مخلص دوستوں کو قتل کروادیا تھا یہاں تک کہ اپنی اولاد پر بھی اعتبار نہ کیا۔

پہلا احتمال

شیخ مفید و شیخ صدوق کی آراء ایک اور مفروضہ کہ جسے جناب شیخ مفید (رح) اور جناب شیخ صدوق (رح) نے تسلیم کیا ہے کہ مامون شروع میں امام رضا علیہ السلام کو اپنا نائب بنانے میں مخلص تھا لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ ابوالفرج، جناب صدوق (رح)، شیخ مفید (رح) نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مامون کہتا ہے کہ ایک روز مجھے اپنے بھائی امین نے بلوایا (مامون اس وقت امین کا ولی عہد تھا) لیکن میں نہ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس کے سپاہی آئے کہ میرے ہاتھ باندھ کر مجھے خلیفہ امین کے پاس لے جائیں۔ خراسان کے نواحی علاقوں میں بہت سی انقلابی تحریکیں سر اٹھا رہیں تھیں۔ میں نے اپنے سپاہیوں کو بھیجا کہ ان کے ساتھ مقابلہ کریں لیکن ہمیں اس لڑائی میں شکست ہوئی۔ اس وقت میں نے تسلیم کرلیا کہ اپنے بھائی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک دن میں نے خدا سے توبہ کی مامون نے جس شخص کو یہ بات بتائی وہ اس کو اس کمرے میں لے گیا کہ میں نے اس کمرے کو دھلوایا پاک و پاکیزہ لباس پہنا۔ اور اللہ تعالیٰ سے منت مانی کہ اگر میں تندرست ہوگیا تو خلافت اس شخص کو دے دوں گا جس کا وہ حقدار ہے۔

اسی جگہ پر جتنا مجھے قرآن مجید یاد تھا میں نے پڑھا اور چار رکعتیں ادا کیں۔ یہ کام میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ کیا۔ اس عمل کے بعد میں نے اپنے اندر انہونی سی طاقت محسوس کی۔ اس کے بعد میں نے کبھی کبھی کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ سیستان کے محاذ پر میں نے اپنی فوج بھی وہاں سے فتح و کامیاب کی خبر ملی پھر طاہر بن حسین کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں بھیجا وہ بھی کامیاب ہوا۔ مسلسل کامیابیوں

کے بعد میں اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ شیخ صدوق اور دیگر شیعہ مورخین
ومحدثین نے اس امر کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ مامون نے نذر مانی تھی
اسلئے اس نے امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا اس کی اور وجہ کوئی نہیں ہے ایک
احتمال تو یہ تھا۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا احتمال

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اقدام یا یہ سوچ مامون کی طرف سے نہ تھی بلکہ یہ
منصوبہ فضل بن سہل نے بنایا تھا۔ اس کے پاس دو رعہدوں کا اختیار تھا، اور مامون کا
قابل اعتماد وزیر تھا (مامون کے ایک وزیر کا نام فضل بن سہل تھا یہ دو بھائی تھے
دوسرے کا نام حسن بن سہل تھا۔ یہ دونوں خالصتاً ایرانی اور مجوسی الاصل تھے)۔
برمکیوں کے دور میں فضل تعلیم یافتہ اور تجربہ کار سیاستدان کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔
علم نجوم میں خاصی دسترس رکھتا تھا۔ برمکیوں کے پاس آ کر مسلمان ہو گیا۔ مؤرخین
نے لکھا ہے کہ اس کا باپ مسلمان تھا۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ یہ سب مجوسی تھے۔ اور
انہوں نے اکٹھے ہی اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد فضل نے ترقی کی اور چند دنوں کے
اندر اندر اسے بہت بڑی وزارت کا قلمدان مل گیا۔ گویا وزیر اعظم نامزد ہو گیا اس
وقت۔ میں وزیر نہ ہوا کرتے تھے، سب کچھ فضل ہی کے پاس تھا۔ مامون کی فوج
میں اکثریت ایرانی تھے۔ عرب فوج نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی
ہوسکتی ہے کہ چونکہ مامون خراسان میں تھا اور امین عرب میں تھا اور ان دونوں کے
درمیان جنگ جاری رہتی تھی۔

عرب امین کو پسند کرتے تھے اور مامون خراسان میں رہنے کی وجہ سے

ایرانیوں کو پسند تھا۔ مسعودی نے مروج الذہب، التنبیہ والاشراف میں لکھا ہے کہ
مامون کی ماں ایرانی تھی۔ اس لیے ایرانی قوم اس کو پسند کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ
حکومت کے تمام تر اختیارات فضل کے پاس منتقل ہو گئے اور مامون کے آلہ کار کے طور
پر رہ گیا) فضل نے مامون سے کہا کہ آپ نے اب تک آل علی علیہ السلام پر بے تحاشا مظالم
کیے ہیں اب بہتر یہ ہے کہ اولاد علی علیہ السلام میں اس وقت سب سے افضل شخص امام رضا
علیہ السلام موجود ہیں ان کو لے آئیں اور اپنے ولی عہد کے طور پر ان کو متعارف کروائیں۔
مامون دلی طور پر اس پر راضی نہ تھا چونکہ فضل نے بات کی تھی اس لیے وہ اس کو ٹال نہ
سکتا تھا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام کا ولی عہدی نامزد کرنا فضل بن سہل کے
پرگراموں میں سے ایک پروگرام تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ فضل شیعہ تھا اور حضرت امام رضا علیہ السلام سے عقیدت رکھتا
تھا؟ یا وہ پرانے مجوسانہ عقائد پر باقی تھا وہ چاہتا تھا کہ خلافت بنوعباس سے لے کر کسی
اور کے حوالے کر دے یا وہ خلافت کو کھلونا بنانا چاہتا تھا کیا وہ حضرت امام رضا علیہ السلام کیلئے
مخلص تھا یا کہ نہیں؟ اگر یہ فضل کا منصوبہ تھا وہ مامون سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا
تھا کیونکہ مامون جیسا بھی تھا کم از کم مسلمان تو تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایران کو
دنیائے اسلام کی فہرست سے نکال کر مجوسیت میں لے جانا چاہتا ہو۔ بھر کیف یہ تھے وہ
سوالات جو مختلف جہتوں سے مختلف افراد کی طرف سے اٹھائے گئے۔ میں یہ کبھی نہیں
کہوں گا کہ تاریخ کے پاس ان سوالات کا کوئی حتمی جواب بھی ہو۔

ممتاز مورخ جرجی زیدان فضل بن سہل کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے
ہوئے کہتا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانا فضل ہی کا کارنامہ ہے، چونکہ فضل ایک
شیعہ تھا اس لیے امام رضا علیہ السلام سے محبت ایک فطری امر تھا۔ لیکن ہم جرجی کے اس
نظریئے کی اس لیے تردید کرتے ہیں کہ یہ بات تواریخ کی کتب میں ثابت نہیں ہوسکی۔

روایات میں ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام فضل کے سخت مخالف تھے۔آپ مامون سے بڑھ کر فضل کی مخالفت کیا کرتے تھے بلکہ اس کو مسلمانوں کے لیے بہت بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے کبھی کبھار آپ مامون کو فضل سے خبردار کیا کرتے تھے فضل اور اس کا بھائی در پردہ امام رضا علیہ السلام کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ چناچہ یہاں پر دو احتمال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ایک یہ کہ ولی عہدی کا پروگرام مامون کا ایجاد کردہ تھا اور مامون منت کو پورا کرتے ہوئے مولا رضا علیہ السلام کو خلافت دینا چاہتا تھا اس کے بعد اس نے یہ ارادہ ترک ولی عہدی بنانے کا پروگرام بنالیا۔

شیخ صدوق اور ہمارے دوسرے علماء نے اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ سارا منصوبہ فضل بن سہل کا تیار کردہ تھا۔بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ فضل ایک مخلص ترین شیعہ تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ نہیں وہ ایک بد باطن شخص تھا اور اس کے عزائم انتہائی خطرناک تھے۔

تیسرا احتمال

الف) شاید ایرانیوں کو خوش کرنا مقصود ہو

ایک احتمال اور ہے کہ ولی عہدی کا پروگرام درحقیقت، مامون ہی کا تھا۔ مامون شروع ہی سے مخلص نہ تھا وہ سب کچھ سیاست اور سازش کے طور پر کر رہا تھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ چونکہ ایرانی قوم شیعہ تھی اور امام علیہ السلام اور آل محمد علیہ السلام سے دلی عقیدت رکھتے تھے، اس لیے مامون نے ایرانیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے یہ قدم اٹھایا۔جس روز مامون نے حضرت رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اس دن اس نے اعلان کیا کہ امام کو رضا کے لقب سے یاد کیا

جائے تا کہ ایرانیوں نے نوے سال قبل "الرضا من آل محمد علیہ السلام" کے نام سے انقلابی تحریک شروع کی تھی اس کی یاد تازہ ہو جائے۔

اپنے آپ سے کہنے لگا کہ پہلے تو ایرانیوں کو راضی کرلوں اس کے بعد امام رضا علیہ السلام کے بارے بھی سوچ لوں گا۔ایک وجہ اور بھی ہے مامون اٹھائیس (۲۸) سالہ نوجوان تھا اور حضرت کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔شیخ صدوق (رح) کے مطابق حضرت کا سن منارک ۴۷ سال تھا شاید یہی قول معتبر ہو۔مامون نے سوچا ہوگا کہ ظاہری طور پر امام کی ولی عہدی میرے لئے نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ امام علیہ السلام بیس سال مجھ سے بڑے ہیں یہ چند سال اور زندہ رہیں گے اور مجھ سے پہلے انتقال کر جائیں گے۔ چنانچہ مامون کی سیاسی چال تھی کہ امام علیہ السلام کو ولی عہد مقرر کر کے ایرانیوں کی ہمدردیاں حاصل کرے۔

ب) علویوں کی انقلابی تحریک کو خاموش کرنا

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مامون نے یہ اقدام علویوں کو خاموش کرنے کیلئے کیا ہے۔علوی اس وقت بہت زیادہ انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور اس حوالے سے ان کو ملک بھر میں ایک خاص شہرت حاصل تھی۔سال میں چند مرتبہ ملک کے کسی کونے یا گوشے میں وہ حکومت کے خلاف تحریک شروع کرتے تھے۔مامون کو علویوں کو راضی کرنے کیلئے یہ اقدام کرنا پڑا۔اس کو یقین تھا جب وہ آل محمد علیہ السلام میں کسی محترم فرد کو اپنی حکومت میں شامل کر لے گا ایک تو عوامی ردعمل میں کمی واقع ہو جائے گی دوسرا وہ اس سے علویوں کو راضی کر لے گا یا وہ اس سے علوی سادات سے اسلحہ لے لے گا۔

جب وہ امام رضا علیہ السلام کو اپنے قریب لے آیا تو بہت سے انقلابیوں کو اس

نے معاف کر دیا۔ امام رضا علیہ السلام کے بھائی کو بھی بخش دیا۔ ایک لحاظ سے فضا خوشگوار ہوگئی دراصل یہ اس کی شاطرانہ چال تھی کہ خلافت یا دوستی کا حوالہ دے کر تمام انقلابی تحریکوں اور مسلح تنظیموں کو خاموش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ پھر موقع پر ایک ایک کر کے انقلابیوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ اب علوی سادات بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے اگر کسی قسم کا قدم اٹھاتے تو لوگوں نے کہنا تھا کہ اب وہ اپنے بزرگ اور آقا امام رضا علیہ السلام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

ج) امام رضا علیہ السلام کو نہتا کرنا

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا منصوبہ مامون ہی نے تیار کیا تھا اس سے وہ سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ امام رضا علیہ السلام کو نہتا کرنا چاہتا تھا۔ ہماری روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون سے فرمایا کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب کوئی فرد منفی سوچ رکھتا ہو اور حکومت وقت پر تنقید کرتا ہو تو وہ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے یہی حال اقوام عالم کا ہے سب سے پہلے تو حکومتیں قوم کو نہتا کرتی ہیں، جب ان سے ہر قسم کا اسلحہ واپس لے لیا جاتا وہ ناکارہ ہوجاتی ہیں تو پھر ظلم کا بازار کھل جاتا ہے اور اپنے مخالفوں کو ہر طرح سے کچل دیتی ہیں۔ اس وقت عوام کا رخ آل علی علیہ السلام کی طرف تھا۔ لوگوں کی دلی خواہش تھی کہ امام رضا علیہ السلام منصب خلافت پر بیٹھیں اور اس غیر آباد دنیا کو آباد کر دیں۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو اور عدل وانصاف کی حکمرانی ہو۔ ظلم کی اندھیری رات چھٹ جائے اور عدل کا سویرا ہو۔

لیکن مامون نے امام علیہ السلام کو ولی عہد بنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حکومت کے ہاتھ مضبوط ہیں۔ امام علیہ السلام بھی حکومت کے ساتھ ہیں وہ ہر لحاظ سے

امام علیہ السلام کو نہتا کرنا چاہتا تھا، اس کی کوشش تھی کہ امام علیہ السلام حکومت میں شامل ہونے کی وجہ سے اپنا ذاتی اثر رسوخ کھو بیٹھیں گے۔ اب تاریخ کے لیے یہ بھی بہت بڑا مسئلہ ہے کہ وہ اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ولی عہدی کا مسئلہ مامون کا ایجاد کردہ ہے یا فضل کو کوئی منصوبہ تھا؟ پھر اگر فضل کا منصوبہ تھا تو اس کی وجہ کیا ہوسکتی تھی؟ اگر اس کی نیت صحیح تھی تو کیا اپنے موقف پر قائم رہا ہے؟ اگر وہ حسن نیت رکھتا تھا تو اس کی سیاست کیا تھی؟ تاریخ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ شیخ صدوق (رح) کا موقف تو یہ ہے مامون کی نیت شروع میں تو ٹھیک تھی لیکن بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ لوگ جب پریشانی ومشکل سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ حق کی طرف لوٹ آتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں لیکن جب وہ مشکل سے نجات حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے کیے ہوئے وعدوں کو بھول جاتے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾

"پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے اس کی عبادت کرنے والے بن کر خدا سے دعا کرتے ہیں پھر جب انہیں خشکی میں (پہنچا کر) نجات دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔" (عنکبوت ٦٥)

مامون کو جب مشکلات نے گھیرا تو اس نے یہ منت مان لی تھی لیکن جب وہ مشکلات سے نکل آیا تو سب کچھ بھول گیا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کے بارے میں تحقیق کریں اور تاریخ کے مسلمہ مکات پر نظر دوڑائیں تو حقیقت کھل کر عیاں ہوجائے گی۔ میرے خیال میں اس تحقیق سے مامون کی نیتوں اور منصوبوں کا بھی پتہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔

تاریخ کیا کہتی ہے؟

ا۔ مدینہ سے امام علیہ السلام کی خراسان میں آمد

تاریخ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے (مرو) خراسان بلوانے پر آپ سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ گویا آپ اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے بلکہ لائے گئے تھے۔ مورخین میں سے ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ امام علیہ السلام کو خراسان لانے سے قبل کوئی خط و کتابت کی گئی ہو۔ یا کسی شخص کے ذریعہ آپ تک پیغام بھجوایا گیا ہو، آپ کو آمد مقصد بالکل نہیں بتایا گیا تھا جب آپ "مرو" میں تشریف لائے تو پہلی بار مسئلہ ولی عہدی پیش کیا گیا۔ اس طرح امام سمیت آل ابی طالب حکومتی اہلکاروں کی نظر میں تھے، یہاں تک کہ جس راسے سے امام علیہ السلام کو لایا گیا وہ راستہ بھی دوسرے راستوں سے مختلف تھا۔ پہلے ہی سے پروگرام طے پایا تھا کہ امام علیہ السلام کو شیعہ نشین علاقوں سے نہ گزارا جائے۔ کیونکہ بغاوت کا خطرہ تھا۔ اس لیے مامون نے حکم دیا کہ امام علیہ السلام کو کوفہ کے راستے سے نہ لایا جائے بلکہ بصرہ خوزستان سے ہوتے ہوئے نیشاپور لایا جائے۔ پولیس کے اہل کار حضرت امام رضا علیہ السلام کے ادھر ادھر بہت زیادہ تھے۔ پھر آپ کے دشمنوں، مخالفوں کو آپ ساتھ تعینات کیا گیا۔ سب سے پہلے تو جو پولیس افسر آپ کی نگرانی کر رہا تھا وہ مامون کا خاص گماشتہ اور وفادار تھا۔ اس کا نام جلودی تھا۔ امام علیہ السلام سے کینہ وبغض رکھتا تھا، یہاں تک کہ جب مسئلہ ولی عہدی مرو میں پیش کیا گیا تو اس جلودی نامی شخص نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مامون نے اسے خاموش رہنے کو کہا لیکن اس نے کہا کہ میں اس کی بھرپور مخالفت کروں گا۔ جلودی اور دوسرے آدمیوں کو زندان میں ڈالا گیا پھر اسی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے ان کو قتل

کر دیا گیا۔

(جلودی بہت ہی ملعون شخص تھا اس نے مدینہ میں علویوں کے خلاف جنگ لڑی لیکن اس کو شکست ہوئی۔ ہارون نے اسی جلودی کو حکم دیا تھا کہ آل ابی طالب علیہ السلام کا تمام مال، زیورات اور لباس وغیرہ لوٹ لے۔ یہ سادات کے دروازے پر آیا لیکن امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تجھے اندر نہیں جانے دوں گا۔ اس نے بہت اصرار لیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے کہا میری یہ ڈیوٹی میں شامل ہے۔ آپ نے فرمایا تو ادھر ہی ٹھہر جا جو کہتا ہے وہ ہم خود ہی تجھے دیتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خود اندر تشریف لے گئے آپ نے بیبیوں سے فرمایا آپ کے پاس جو چیز بھی ہے کپڑے، زیورات وغیرہ وہ سب مجھے دے دو تا کہ میں جلودی کو دے دوں)

مورخین نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک روز ہارون نے حضرت امام علیہ السلام اور فضل کی موجودگی میں جلودی کو اپنے دربار میں بلوایا اور اس سے کہا کہ اپنے موقف پر نظر ثانی کرے۔ لیکن جلودی اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم سو فی صد اس بات کی مخالفت کریں گے بلکہ ایک شخص نے بدتمیزی بھی کی۔ ہارون نے حکم دیا ان میں سے جو بھی ہماری بات نہ مانے ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ چنانچہ دو افراد کو اس وقت قتل کر دیا گیا۔ جلودی کی باری آئی۔ امام رضا علیہ السلام نے ہارون سے فرمایا کہ اسے معاف کر دو لیکن جلودی نے کہا اے امیر! میری آپ سے ایک درخواست ہے وہ یہ ہے کہ اس شخص یعنی (امام علیہ السلام) کی سفارش میرے بارے میں قبول نہ کیجئے۔ مامون نے کہا تیری قسمت خراب ہے۔ میں امام علیہ السلام کی سفارش قبول نہیں کرتا۔ اس نے تلوار اٹھائی اس وقت جلودی کو ڈھیر کر دیا۔ بھر حال امام رضا علیہ السلام کو خراسان لایا گیا۔ تمام سادات ایک جگہ پر اور امام رضا علیہ السلام ایک جگہ پر۔۔۔۔۔ لیکن پولیس کے سخت پھروں میں تھے اس وقت مامون نے کہا آقا میں آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ

بات تاریخ کی مسلمہ حقائق میں سے ہے۔

۲۔امام رضا علیہ السلام کا انکار

جیسا کہ ہم نے کہا کہ مدینہ میں حضرت سے ولی عہدی کی بات بھی نہ کی گئی اور نہ اس سے متعلق کوئی مشورہ لیا گیا" مرو" میں جب آپ کو ولی عہدی کی بابت بتایا گیا تو آپ نے شدید انکار کیا۔ ابوالفرج نے مقاتل الطالبین میں لکھا ہے کہ مامون نے فضل بن سہل اور حسن بن سہل کو امام علیہ السلام کے پاس بھیجا جب ان دونوں بھائیوں نے آپ کی ولی عہدی کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہوگا اور تم لوگ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم مجبور ہیں ہمیں اوپر سے حکم ہوا ہے کہ اگر آپ نے انکار کیا تو آپ کا سر قلم کر دیں گے۔ شیعہ علماء نے بار بار اس تاریخی جملہ کو ذکر کیا ہے کہ انکاری کی صورت میں آپ کو اسی وقت قتل کر دیا جاتا لیکن مورخین نے یہ بھی لکھا ہے حضرت نے قبول نہ فرمایا۔ یہ دونوں مامون کے پاس گئے دوسرا مرتبہ مامون خود حضرت کے پاس آیا اور بات چیت کی۔ آخر میں امام علیہ السلام کو قتل کی دھمکی بھی دی۔۔۔ ۔۔۔۔ اور کہا آپ اس عہدے کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ کیا آپ کے دادا علی علیہ السلام نے مجلس شورائی میں شرکت نہ کی تھی؟ اس سے وہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ تمہارا خاندانی شیوہ ہے

دوسرے لفظوں میں جب حضرت علی علیہ السلام نے شوریٰ میں شرکت فرمائی تو خلیفہ کے انتخاب میں دخل اندازی کی، اور یہ مانتے اور جانتے ہوئے خاموش ہو گئے کہ خلافت اللہ کی طرف سے انہی کا حق ہے۔ اور آپ نے آنے والے لمحوں کا انتظار کیا۔ پس جب آپ کے دادا علی نے شوریٰ کے فیصلوں کو تسلیم کیا ہے تو آپ ہماری مشاورتی کمیٹی میں شمولیت اختیار کیوں نہیں کرتے؟ امام علیہ السلام نے مجبور ہو کر

قبول کر لیا اور خاموش ہو گئے۔ البتہ آپ کے سوال کا جواب باقی ہے جو کہ ہم نے اپنی اس گفتگو میں دینا ہے کہ جب امام علیہ السلام نے انکار کر دیا تھا تو اپنے اس موقف پر قائم رہتے اگر چہ اس کے لیے آپ کو جان بھی قربان کرنی پڑتی۔۔۔۔۔ کر لیتے۔ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنی مظلومانہ شہادت کو قبول کر لیا۔ لیکن یزیدیت کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا۔ جب انکار ہی کیا تھا تو انکار ہی رہنے دیتے؟ اس سوال کا جواب ہم اس گفتگو میں دیں گے۔

۳۔امام رضا علیہ السلام کی شرط

مورخین نے لکھا ہے کہ امام علیہ السلام نے ایک شرط عائد کی کہ ولی عہدی کا منصب میں اس صورت میں قبول کروں گا کہ حکومتی اور سرکاری معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کروں گا اور کوئی ذمہ داری بھی نہ لوں گا۔ درحقیقت آپ مامون کے کسی کام میں تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گویا آپ ایک طرح کی مامون کی مخالفت کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح کا احتجاج تھا اور احتساب بھی۔ مامون نے امام علیہ السلام کی یہ شرط مان لی لیکن امام علیہ السلام نماز عید میں بھی شرکت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مامون نے امام علیہ السلام سے کہا کہ آپ اس عید پر ضرور تشریف لائیں۔ آپ نے فرمایا یہ میرے معاہدے کے خلاف ہے۔ مامون بولا لوگ ہمارے خلاف طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، اس مرتبہ آپ ہر حالت میں شرکت فرمائیے۔ حضرت علیہ السلام نے فرمایا ٹھیک ہے آپ نے ایسی صورت میں مامون کی دعوت قبول فرمائی کہ مامون اور فضل کو شرمندگی اٹھانا پڑی، کیونکہ آپ کی وجہ سے ایک بہت بڑے انقلاب کے برپا ہونے کا خطرہ تھا۔ اسی خوف اور خدشے کی بناء پر آپ کو راستہ ہی میں واپس بھیج دیا گیا اور آپ کو باہر اس لیے نہیں جانے دیا گیا کہ اگر

آپ عید کے اجتماع میں شرکت کرتے ہیں تو لوگوں کا انبوہ کثیر آپ کی بیعت کر کے حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔

۴۔ ولی عہدی کے اعلان کے بعد امام علیہ السلام کا رویہ

اس مسئلہ سے بھی اہم مسئلہ ولی عہدی کے اعلان کے بعد امام رضا علیہ السلام کا مامون کے ساتھ بے غرضانہ رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے علماء اور مورخین نے کھلے لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ جب امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد نامزد کیا جا چکا تو آپ نے ڈیڑھ سطر کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اپنی پالیسی کھل کر بیان کی آپ نے اس خطبہ میں نہ مامون کا نام لیا اور چھوٹا سا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ حالانکہ سرکاری پروٹوکول کے مطابق آپ مامون کا نام لینے کے ساتھ ساتھ شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا۔ ابوالفرج بیان کرتے ہیں کہ مامون نے ایک دن اعلان کیا کہ فلاں روز ملک بھر کے عوام ایک جگہ پر جمع ہوں اور علانیہ طور پر امام رضا علیہ السلام کی بیعت کی جائے چنانچہ ایک بہت اجتماع ہوا، اس میں مامون نے امام علیہ السلام کے لیے کرسی صدارت بچھوائی۔ سب سے پہلے مامون کے بیٹے عباس نے بیعت کی پھر علوی سید کو موقعہ بیعت دیا گیا۔ اس طرح ایک عباسی اور ایک علوی بیعت کے لیے آتے جاتے رہے اور ان بیعت کرنے والوں کو بہترین انعامات بھی دیئے گئے۔ آپ نے بیعت کیلئے دوسرے طریقے رکھے ہوئے تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میرے جد بزرگوار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طریقے سے بیعت لیتے تھے لوگوں نے آپ کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی، خطباء، شعراء اور مقررین نے اپنے الفاظ اور اپنے اپنے انداز میں سرکار رضا علیہ السلام کی مدح سرائی کی۔ بعض شعراء نے مامون کو بھی سراہا اس کے بعد مامون نے امام

رضا علیہ السلام سے کہا:

قم فاخطب الناس وتکلم فیہم "

آپ اٹھ کر لوگوں سے خطاب کریں مامون کو یہ توقع تھی کہ امام علیہ السلام اس کے حق میں توصیفی کلمات ادا فرمائیں گے۔

"فقال بعد حمد اللہ والثناء علیہ"

مسئلہ ولی عہدی امام رضا علیہ السلام

ہم امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس نشست میں بھی ہم اس اہم تاریخی موضوع پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ جرجی زیدان کی طرح کچھ مورخین نے کھلےلفظوں میں کہا ہے کہ بنوعباس کی سیاست نیکیوں کو چھپانا اور حقائق کو دبانا تھا۔ جس کی وجہ سے تاریخ میں سے کچھ چیزیں ایسی بھی رہ گئی ہیں جن کے بارے میں آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ولی عہدی کا مسئلہ امام رضا علیہ السلام سے شروع نہیں ہوا یعنی امام رضا علیہ السلام نے ولی عہد بننے کی نہ خواہش ظاہر کی اور نہ آپ دلی طور پر مامون کا نائب خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور نہ ہی امام وقت کے شایان شان تھا۔ دراصل شروع ہی اس مسئلہ کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا۔ مامون خراسان میں تھا۔ خراسان اس زمانے میں روس کے ساتھ ملتا جلتا تھا۔ مامون وہاں سے چند افراد کو مدینہ روانہ کرتا ہے۔ کس لیے امام رضا علیہ السلام کو بلوانے کیلئے۔

امام رضا علیہ السلام کی خراسان میں آمد کا پروگرام تک نہ تھا اور آپ کو ان راستوں، شہروں، علاقوں اور دیہاتوں سے گزار کر لایا گیا کہ جہاں آپ کے ماننے اور جاننے والے موجود نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں امام رضا علیہ السلام پولیس کے کڑے پہرے میں قید کر کے لایا جا رہا تھا۔ جب آپ مرو پہنچے تو آپ کو ایک الگ مکان میں لایا گیا۔ مامون اور امام علیہ السلام کے مابین پہلی جو گفتگو تھی وہ یہ تھی کہ میں آپ کو خلافت کی باگ دوڑ دینا چاہتا ہوں۔ پھر کہا کہ اگر آپ یہ قبول نہ فرمائیں تو ولی عہدی کا منصب ضرور قبول کریں۔ آپ نے سخت انکار کیا۔ اب سوال یہ ہے امام علیہ السلام کے انکار کی وجہ

کیا ہے؟ اس سلسلے میں ہم روایات کی طرف چلتے ہیں دیکھتے ہیں وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے امام علیہ السلام کو انکار کرنا پڑا؟ عیون اخبار الرضا میں ذکر ہوا ہے کہ مامون نے امام رضا علیہ السلام سے کہا میں سوچ رہا ہوں کہ مسند خلافت چھوڑ کر اسے آپ کے حوالے کروں اور آپ کی بیعت کروں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا تم خلافت کے مستحق ہو کہ نہیں؟ اگر حقدار ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تمہارے پاس امانت ہے اسے ہر صورت میں اپنے پاس رکھو اگر اس پر تمہارا حق نہیں ہے تو پھر بھی اس پر قابض رہو؟ اس سے امام کا مقصد یہ تھا اگر خلافت تمہارا حق نہیں ہے تو یزید کے بیٹے معاویہ کی طرح اعلان کرو کہ میں حقدار نہیں ہوں۔ میرے آباء واجداد نے غلطی کرتے ہوئے مجبوراً عنان حکومت میرے ہاتھ میں دی ہے۔ معاویہ بن یزید نے کہا تھا کہ میرے باپ دادا نے خلافت غصب کر کے اس پر ناجائز طور پر قبضہ جمایا تھا اور میں جامہ خلافت کو اتار کر واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم بھی خلافت دینا چاہتے ہو تو اسی طرح کرو۔ سب سے پہلے تو آپ کو اپنے آباء واجداد اور ان کے انداز حکومت کو ناجائز اور غلط کہنا ہوگا۔ ہارون نے جب یہ بات سنی تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور گفتگو کو بدلتے ہوئے اچھا چھوڑو اس بات کو شاید آپ کی کوئی مجبوری ہے۔

پھر مامون نے کہا کہ آپ کو ہماری شوریٰ میں شرکت تو کرنا پڑے گی۔ مامون ایک پڑھا لکھا شخص تھا۔ حدیث، تاریخ، فلسفہ، ادبیات پر اسے مکمل عبور حاصل تھا۔ طب ونجوم پر بھی خاص مہارت رکھتا تھا۔ آپ اسے وقت کا قابل ترین شخص بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاید سلاطین وخلفاء میں مامون جیسا قابل اور لائق شخص پیدا ہی نہیں ہوا ہو۔ اس نے دلیل کا سہارا پکڑتے ہوئے کہا کہ آپ کے دادا علی علیہ السلام نے بھی شوریٰ میں شمولیت اختیار کی تھی؟

اس وقت کی شوریٰ میں چھ آدمی تھے۔ فیصلہ اکثریت کے پاس تھا۔ اس

وقت کسی نے دھمکی دی تھی کہ اگر شوریٰ کے فیصلے سے کسی نے انکار کیا تو ابوطلحہ انصاری اس کا سر قلم کر دے گا۔ یہ صورت حال بھی اس جیسی ہے۔ لہذا آپ اپنے دادا علی علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کو قبول کریں۔ ایک لحاظ سے مامون امام علیہ السلام کو سمجھانے کی ایک لا حاصل کوشش کر رہا تھا کہ آپ کے دادا علی علیہ السلام نے خلافت کو اپنا حق جاننے ہوئے بھی شوریٰ کے فیصلوں کو تسلیم کیا حالانکہ علی علیہ السلام کو اس وقت احتجاج کرنا چاہیے تھا، اور آپ شوریٰ میں شامل ہی نہ ہوتے اور اس وقت تک اپنا احتجاج جاری رکھتے جب تک کہ ان کو اپنا حق نہ مل جاتا، لیکن آپ نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی مرضی سے ہی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی، اور اپنی خوشی سے خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیا۔

لہذا اب بھی وہی صورت حال ہے بہتر یہ ہوگا کہ آپ ہماری شوریٰ میں آجائیں لیکن آپ کی خاموشی اور انکار کے بعد اس نے دھمکی آمیز رویہ اپناتے ہوئے امام علیہ السلام کو ولی عہد بننے پر مجبور کیا۔ یہ نظریہ قطعی طور پر درست نہیں ہے کہ امام علیہ السلام نے ڈر اور خوف کی وجہ سے ولی عہدی کا منصب قبول کیا ہے۔ دراصل یہ سب کچھ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کیلئے کیا گیا۔ دوسرا آپ نے امامت کی ذمہ داریاں بھی دوسرے امام کی طرف منتقل کرنا تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی شرعی ذمہ داریاں تھیں جن کو امام علیہ السلام نے نبھانا تھا۔ اگر تاریخی حقائق کو دیکھا جائے تو یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ آپ نے مامون کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ آپ کا ایک بار ٹھکرانا اس بات کی دلیل ہے کہ امام علیہ السلام مامون کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے نہ اس کی کسی قسم کی مدد کرنے کو تیار تھے۔ پھر مصلحت کے ساتھ آپ کو خاموش اختیار کرنا پڑی۔

تیسرا مسئلہ جو کہ بہت اہم ہے کہ امام علیہ السلام نے اس پر شرط عائد کی کہ میں خلافت اور حکومت کے کاموں میں مداخلت نہیں کروں گا، اس صورت میں مجھے نائب

خلیفہ مقرر کرنا ہے تو کر لو، میرے نام پر سکہ جاری کرنا ہے تو کر لو۔ میرا نام استعمال کرتے ہوئے خطبہ پڑھنا ہے تو پڑھ لو، لیکن عملی طور پر مجھے اس سے دور رکھو۔ میں نہ عدالتی، حکومتی، امور میں دخل اندازی کروں گا اور نہ کسی کو مقرر اور معطل کرنے میں حصہ لوں گا۔ اس کے علاوہ آپ نے حکومت کا سرکاری پروٹوکول بھی قبول نہ کیا۔ اس لحاظ سے آپ اس کو سمجھا رہے تھے کہ وہ اس کی حکومت کے خیر خواہ نہیں ہیں اور نہ ہی اس خلافت کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایک روز مامون نے ملک کے سرکردہ افراد، سیاسی و مذہبی شخصیات کو مدعو کیا۔ سب کو سبز لباس پہننے کی تلقین کی گئی۔ فضل بن سہل نے سبز لباس تجویز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عباسیوں کا پسندیدہ رنگ کالا تھا۔ فضل نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سبز لباس پہن کر کانفرس میں شرکت کریں۔ کہا جاتا ہے یہ رنگ مجوسیوں کا پسندیدہ رنگ تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات کسی حد تک سچی ہو؟ چنانچہ وقت مقررہ پر سب شرکاء پہنچ گئے۔ جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے امام علیہ السلام کی ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی۔ اس سلسلے میں مامون کے بیٹے عباس نے امام علیہ السلام کی بیعت کی، اس سے قبل وہ اپنے باپ کا ولی عہد تھا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگ آتے رہے بیعت کرتے رہے۔ پھر شعراء، خطباء کی باری آئی۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں انتہائی خوبصورت اشعار کہہ کر محفل کو پر کیف بنا دیا۔ اس کے بعد امام علیہ السلام کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ آپ اپنی نشست سے اٹھ کر سٹیج پر تشریف لائے۔ اور ڈیڑھ سطر پڑھ کر اپنا خطبہ مکمل کر لیا آپ نے فرمایا ہم (اہلبیت اطہار علیہ السلام، ہمارے آئمہ) آپ لوگوں پر حق رکھتے ہیں کہ تمہارے سربراہ مقرر ہوں۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ پر ہمارا اور ہمارا آپ پر حق ہے۔ آپ کا ہم پر حق یہ ہے کہ ہم آپ کے سب حقوق کی حفاظت کریں اور امور زندگی میں آپ کی مدد کریں، اور آپ کا

فرض یہ ہے کہ ہماری پیروی کریں اور ہم سے رہنمائی لیں۔ آپ لوگوں نے جب ہی ہمیں خلیفہ برحق کے طور پر تسلیم کرلیا تو ہم پر لازم ہے کہ اپنے وظیفہ کو احسن طریقے سے نبھائیں۔ علامہ مجلسی کی شہرہ افاق کتاب بحارالانوار میں یوں عبارت درج ہے:

"لنا علیکم حق برسول الله ولکم علینا حق به فاذا انتم ادیتم الینا ذلك وجب علینا الحق لکم "[1]

اس کا مفہوم اور معنی اوپر درج کیا جاچکا ہے دوسرے لفظوں میں ہم اس کی تعبیر کچھ اس طرح کر سکتے ہیں کہ امام علیہ السلام لوگوں سے یہ کہہ رہے تھے خلافت ہمارا حق ہے تمہارے حق یہ ہے، کہ خلیفہ آپ کے مسائل کو حل کرے۔ آپ پر فرض ہے کہ ہمارا ہمیں حق دیں اور ہم اس ذمہ داری کو نجوبی انجام دیں گے۔

اس میں آپ نے مامون کا نام تک نہ کیا اور نہ ہی اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح محسوس ہورہا تھا کہ جس طرح امام علیہ السلام مامون کی ولی عہدی کے خلاف بول رہے ہوں۔ پھر آپ نے عملی طور پر بھی کر دکھایا۔ مامون کے حکومتی امور میں مداخلت نہ کی اور نہ کسی قسم کا شاہی اعزاز لیا جب کہ مامون نے عرض کی تھی کہ آپ نماز عید میں سرکاری طور پر شرکت فرمائیں، لیکن آپ نے اس سے انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ کیا آپ سے معاہدہ نہیں ہوا کہ میں حکومتی امور میں مداخلت نہ کروں گا۔ جب اس نے اصرار کیا کہ میں اپنے جد بزرگوار کی سنت پر عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلتا ہوں اس نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ امام علیہ السلام جب عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں اور پورے شہر میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ مامون نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے امام علیہ السلام کو واپس گھر بھجوادیا۔

[1] بحارالانوار، ج ۴۹، ص ۱۴۶

چنانچہ ان شواہد سے یہ ثابت ہوگیا کہ آپ کی ولی عہدی کا منصب قبول کرنا امام علیہ السلام کی مرضی کے خلاف تھا۔ زبردستی طور پر آپ کو اقرار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پھر آپ نے مصلحت کے تحت اس منصب کو قبول تو کر لیا لیکن حکومت کے کسی مسئلہ میں مداخلت نہ کی اور نہ ہی کسی لحاظ سے شریک اقتدار ہوئے اور آپ نے اس انداز سے کنارہ کشی کی کہ دشمن کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ اور آپ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ حق و باطل، دن اور رات ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔

مشکوک مسائل

اب تک ہم نے کچھ مسائل پر بحث کی ہے دراصل یہ مشکوک نظر آتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔ پھر علماء و مورخین کا بھی آپس میں اختلاف ہے کہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ مامون امام علیہ السلام کو مدینہ سے مرو بلائے اور اپنے خاندان کو نظر انداز کر کے خلافت آل محمد علیہ السلام کے سپرد کر دے؟ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا فضل بن سہل کے مشورے سے ہوا ہے۔ بعض مورخین نے اس کو فضل کا تجویز کردہ منصوبہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ قول انتہائی کمزور ہے۔ جرجی زیدان نے بھی امام کی ولی عہدی کے مشورہ کو فضل کا پروگرام تسلیم کیا ہے۔ ان کے بقول فضل بن سہل شیعہ تھا وہ اور دل جان سے آل محمد علیہم السلام کو خلافت سپرد کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ قول صحیح ہوتا تو امام رضا علیہ السلام فضل کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرتے تھے تو پھر آپ کو جان سے مار دینے کی دھمکی کیوں دی جارہی تھی۔

اگر آپ نے ولی عہدی قبول ہی کر لی تھی تو کھل کر حکومتی امور میں مداخلت کرتے۔ پروٹوکول سے لطف اندوز ہوتے اور کوشش کر کے مامون سے مسند خلافت لے ہی لیتے؟ البتہ یہاں پر بھی ایک اعتراض اٹھتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر امام علیہ السلام اور فضل

بن سہل ایک دوسرے کے تعاون سے مامون سے خلافت لے لیتے تو پھر بھی فضا خوشگوار نہ ہوسکتی تھی؟ خراسان ایک اسلامی مملکت تھی۔ عراق، حجاز، یمن، مصر، شام الگ الگ ریاستیں تھیں، ان لوگوں کے خیالات اور حالات اہل ایران سے جدا تھے۔ بلکہ ان ملکوں کے لوگ ایرانیوں کے زبردست مخالف تھے۔ بالفرض اگر امام رضا علیہ السلام خراسان کے حاکم ہوتے اور بغداد میں کوئی اور مدمقابل ہوتا اور امام کی ولی عہدی کی خبر بغداد تک پہنچتی اور بنی عباس کو اس کا پتا چلتا تو وہ مامون کو معزول کر کے ابراہیم کو امیدوار کھڑا کر کے اس کی بیعت کر لیتے۔ اس وقت بہت بڑا انقلاب برپا ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ ضرور اس بات کا احتجاج کرتے کہ ہم نے ایک سو سال محنت کی ہے، اور بے تحاشہ تکلیفیں دیکھیں ہیں۔ اب اس آسانی سے علویوں کو خلافت کیوں دے دیں۔ بغداد میں احتجاج برپا ہوجاتا اور گردونواح کے لوگ بھی امام علیہ السلام کی مخالفت میں متحد ہو سکتے تھے۔۔ یہ بات بھی حقیقت سے بہت دور ہے اس کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا جاسکتا کہ فضل بن سہل شیعہ ہونے کی بناء پر امام علیہ السلام کو مسند خلافت پر لانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے تو ولی عہدی کا مسئلہ اس کا تجویز کردہ نہیں تھا، دوسرا اس کا شیعہ ہونا وہ بھی تردید سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نومسلم تھا۔ وہ ایران کو زمانہ سابق والے ایران کی طرف لانا چاہتا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ چونکہ ایرانی لوگ پکے مسلمان ہیں وہ اس قدر آسانی سے کوئی بات قبول نہ کریں گے۔ وہ اسلام کے نام پر عباسی خلیفہ سے خلافت لے کر امام رضا علیہ السلام کو دینا چاہتا تھا، پھر وہ امام رضا علیہ السلام کو گوناگوں مشکلات میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر یہ بات درست ہے تو امام علیہ السلام کے لیے محتاط رہنا ضروری اور آپ نے انتہائی محتاط انداز میں قدم رکھا۔

کیونکہ فضل کے ساتھ چلنا اور تعاون کرنا مامون کی نسبت زیادہ مشکل اور خطرناک تھا۔ اس کے مقابلے میں مامون جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا فضل سے اچھا تھا،

کیونکہ مامون ایک مسلم خلیفہ تھا۔ ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تمام خلفاء ایک جیسے نہ تھے۔ یزید اور مامون میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مامون ایک تو پڑھا لکھا دانشور اور علم دوست تھا۔ بہترین حاکم، بہترین سیاسدان تھا۔ اس نے جو فلاحی و رفاہی کام کیے شاید کسی اور عباس خلیفے نے نہ کئے ہوں؟

آج کل جو علمی و اسلامی ترقی مسلم قوموں میں موجود ہے اس میں ہارون و مامون کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ یہ روشن فکر اور جدید سوچ رکھنے والے حکمران تھے، آج بہت سے اسلامی کارنامے ان دونوں سلاطین کے مرہون احسان ہیں۔ یہ تو تھا اس کی شخصیت کا مثبت پہلو، لیکن اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ اقتدار کے لیے اپنے بیٹے کو بھی قتل کرنے کا قائل تھا۔ یہ جس امام علیہ السلام کو اچھا سمجھتا تھا اس نے اپنے ہاتھ سے انہیں زہر دے کر مروادیا۔ بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔

اگر حقیقت حال ایسی ہو کہ جیسا کہ ہم نے بیان کی ہے کہ ولی عہدی کا مسئلہ فضل کا تجویز کردہ ہو تو امام علیہ السلام اور تمام مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ تھا، کیونکہ فضل بن سہل کی نیت درست نہ تھی۔ ہماری شیعہ روایات کے مطابق امام رضا علیہ السلام فضل بن سہل سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جب فضل اور مامون کے مابین اختلاف ہوجاتا تو امام علیہ السلام مامون کی حمایت کرتے تھے۔ روایات میں ہے کہ فضل اور ہشام بن ابراہیم حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ خلافت تو حق آپ کا ہے یہ سب غاصب ہیں۔ آپ اگر ساتھ دیں تو ہم مامون کا کام تمام کردیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ رسمی طور پر خلیفہ ہوجائیں گے۔ حضرت نے ان دونوں کی اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا جس سے انہوں نے سمجھا کہ انہوں نے ایسی بات کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں فوراً مامون کے پاس آئے اور کہا کہ ہم امام علیہ السلام کے پاس گئے۔ اور ان کا امتحان لینے کیلئے ہم نے ان سے کہا کہ آپ اگر ہمارا

ساتھ دیں تو ہم مامون کو قتل کر سکتے ہیں، لیکن امام علیہ السلام نے انکار کر دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ مخلص ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب مامون کی امام سے ملاقات ہوئی تو مامون نے فضل اور ہشام کی بات امام علیہ السلام کو بتلائی، تو امام علیہ السلام نے فرمایا یہ دونوں جھوٹ کہتے ہیں یہ واقعتاً آپ کے دشمن ہیں۔ اس کے بعد آپ علیہ السلام نے مامون سے فرمایا ان دونوں سے احتیاط کیا کرو یہ کسی وقت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

روایات کے مطابق حضرت علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام مامون کی نسبت فضل بن سہل سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے۔ ان حقائق کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی عہدی کی تجویز فضل ہی کی تھی۔ یہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ اس نے سلام کا نام لے کر بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔ اور ترقی کرتے کرتے وزارت عظمیٰ کے عہد پر پہنچ گیا۔ امام علیہ السلام اس شخص کی اس اس تجویز کو قطعی طور پر اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ آپ کو ان کی نیتوں پر شک تھا بلکہ آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ فضل اسلام اور امام علیہ السلام کا نام استعمال کر کے ایران کو صدیوں پیچھے کی طرف دھکیلنا چاہتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر فضل کی تجویز کارآمد ہوتی تو امام علیہ السلام مامون کے خلاف فضل ہی کی حمایت کرتے۔ امام علیہ السلام شروع ہی سے فضل کو ایک مفاد پرست، سازشی انسان سمجھتے تھے۔ ایک اور فرض کہ اگر یہ تجویز مامون کی تھی تو سوچنے کی بات ہے کہ مامون نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس کی نیت اچھی تھی یا بری؟ اگر اس کی نیت اچھی تھی تو کیا اپنے اس فیصلے پر برقرار رہا یا فیصلہ بدل لیا؟ اگر یہ کہیں کہ وہ حسن نیت رکھا تا تھا اور آخر تک اسی پر قائم رہا تو یہ بات بالکل ہی قابل قبول نہیں ہے۔ یہ نکتہ کسی حد تک درست ہے کہ وہ شروع میں تو مخلص تھا لیکن بعد میں بدل گیا۔ شیخ مفید اور شیخ صدوق کا نظریہ بھی یہی تھا۔ جناب شیخ صدوق اپنی مشہور کتاب عیون اخبار الرضا میں لکھتے ہیں کہ مامون شروع میں امام کی ولی عہدی کے بارے میں اچھی نیت رکھتا تھا کیونکہ اس

نے واقعی طور پر منت مانی تھی۔

وہ اپنے بھائی امین کے ساتھ الجھ گیا تھا۔ اس نے منت مانی تھی کہ اگر خدا نے اس اس کے بھائی امین پر فتح اور غلبہ دیا تو وہ خلافت کو اس کے حقدار کے سپرد کر دے گا۔ امام رضا علیہ السلام نے بھی اس کی پیشکش کو اس لیے ٹھکرا دیا کہ اس نے جزبات میں آ کر یہ فیصلہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شخص اپنے تمام ارادے تمام قسمیں توڑ ڈالے گا۔ لیکن کچھ مورخین نے یہ لکھا ہے کہ وہ شروع ہی سے اچھی نیت نہ رکھتا تھا۔ یہ اس کی ایک سیاسی چال تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی سیاسی چال کیا تھی؟ کیا وہ امام علیہ السلام کے ذریعہ سے علویوں کی تحریک کو کچلنا چاہتا تھا؟ یا امام رضا علیہ السلام کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امام علیہ السلام ایک گوشہ میں خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور مامون پر سخت تنقید کیا کرتے تھے۔

اس لیے اس نے منصوبہ بنایا کہ حضرت کو حکومت میں شامل کر کے تنقید کا سلسلہ بند کرے۔ جیسا کہ عام طور پر تمام سیاستدان کرتے ہیں اور وہ اپنے مخالفوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کی عوامی مقبولیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف سیاسی اہداف و نظریات بدلنے والوں کی جانی قربانی بھی دینی پڑتی ہے کیونکہ دشمن بالآخر دشمنی ہی ہوتا ہے۔ ہمارے اس مدعا کی تائید یہ روایات بھی کرتی ہیں کہ امام علیہ السلام نے ایک مرتبہ مامون سے کہا تھا کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم مجھے حکومت میں شامل کر کے میری روحانی ساکھ خراب کرنا چاہتے ہو۔ یہ سن کر مامون غصے میں آ گیا اور اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا، اور بولا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اس قسم کی باتیں مجھ سے منسوب کیوں کرتے ہیں؟

چند اعتراضات ایک مفروضہ یا سوال یہ بھی ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام فضل (جو کہ شیعہ تھا) کے ساتھ تعاون کرتے تو بہتر تھا، پھر آپ نے خلافت کو دلی طور

پر قبول کیوں نہیں کیا؟ ہمیں یہیں سے اصل قضیہ یا مسئلہ کو سمجھنا چاہیے کہ ہم ایک نکتہ نظر سے نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار شخص کے طور پر سوچتے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام دیندار شخص تھے یا دینا دار؟ اگر دیندار تھے تو جس وقت آپ کو خلافت مل رہی تھی تو آپ فضل کے ساتھ تعاون کرتے اگر دنیا دار تھے تو بھی اس کے ساتھ ہر ممکن مدد کرتے لیکن آپ نے اس کے ساتھ تعاون نہ کر کے ثابت کر دیا کہ یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔

لیکن اگر یہ مفروضہ ہو کہ فضل اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا، تو امام علیہ السلام کا اقدام بالکل صحیح تھا، کیونکہ حضرت نے دوسرے اشخاص میں سے اس شخص کو چنا جو برائی کے لحاظ سے کم تھا، وہ تھا مامون کی ولی عہد کو قبول کرنا (وہ بھی شرط عائد کر کے قبول کیا)۔

سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر ولی عہدی کی دعوت دینا مامون کی تجویز کردہ تھی تو امام علیہ السلام کو ہر حال میں مامون کی دعوت قبول نہیں کرنے چاہیے تھی بلکہ اس کے خلاف بھر پور طریقے سے جہاد کرتے۔ اس معاہدے سے جان دے دینا بہتر تھا اور آپ کسی لحاظ سے بھی حکومت میں شمولیت اختیار نہ کرتے؟ یہاں پر اس وقت انصاف کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر امام اپنی جان قربان کر دیتے تو کیا شرعی لحاظ سے بہتر تھا؟ بسا اوقات جان بچانا واجب ہے۔ اور کبھی جان قربان نہ کرنا جرم ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے زندہ رہتے۔

آپ نے اس مدت میں دینی علوم کی ترویج و اشاعت کی طرف بھر پور کوشش کی۔ ظلم کے خلاف عملی طور پر آواز اٹھانا، امام علیہ السلام کی موجودگی میں عباسی خلفاء بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جسارت کرنے کی جرآت نہ کر سکتے تھے۔ لیکن جب مسئلہ بہت سنگین صورت اختیار کر جائے جیسا کہ یزید نے امام حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کی تھی تو آپ نے بیعت کرنے سے جان دینے کو ترجیح دے دی۔ یہ

واقعہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب معاشرہ انسانی کو اس قسم کی قربانی کی اشد ضرورت تھی۔ دوسرے لفظوں میں دنیائے اسلام کو بیدار کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے وہی کچھ کرنا ضروری تھا جو کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کیا۔ لیکن امام رضا علیہ السلام کا زمانہ کچھ اور تھا۔ ہمارے سبھی آئمہ نے جام شہادت نوش کیا۔ اگر اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالتے تو بات اور تھی لیکن اکثر آئمہ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ شیعہ روایات کی رو سے اکثر آئمہ کی شہادت زہر کے ذریعہ ہوئی ہے۔

یہ تو بے اختیاری کی صورت میں تھا۔ اب اگر ایک شخص کو اختیار دیا جائے کہ جان قربان کر دے یا وہ کام کرے جو کہ قاتل لینا چاہتا ہے؟ مثال کے طور پر اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ غروب سے پہلے قتل ہو جاؤں یا فلاں کام انجام دے دوں، تو ظاہر ہے زندگی کو ترجیح دوں گا۔ امام رضا علیہ السلام بھی دو کاموں میں صاحب اختیار تھے یا قتل ہو جاتے یا ولی عہدی کا منصب قبول کر لیتے؟ آپ نے اگر قتل کو ترجیح دی ہوتی تو تاریخ آپ کو کسی صورت میں معاف نہ کرتی۔ آپ نے دو صورتوں میں سے جو بہتر تھی اس کو اختیار کیا۔ آپ نے وقتی طور پر ولی عہدی کی حامی تو بھر لی لیکن مامون اور اس کی حمایت کی کسی طرح بھی حمایت نہ کی اور نہ ہی سرکاری امور میں تعاون کیا۔

آئمہ اطہار علیہ السلام کی نظر میں خلفاء کے ساتھ تعاون کرنا

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام باوجودیکہ عباسی خلفاء کے سخت مخالف تھے اور اکثر اوقات لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے سے منع کرتے تھے لیکن جب اسلامی اہداف اور دینی مقاصد کے فائدے کی بات ہوتی تو آپ اپنے ماننے والوں کو حکومت وقت کے ساتھ تعاون کرنے پر تشویق کرتے تھے۔
صفوان جمال امام موسیٰ کاظم کا ماننے والا ہے۔ سفر حج کے لیے ہارون کو اونٹ کرائے پر دیتا ہے، امام علیہ السلام کی خدمت میں آتا ہے، حضرت اس سے کہتے ہیں ایک کام کے سوا آپ کے سب کام ٹھیک ہیں۔ صفوان عرض کرتا ہے وہ کونسا؟ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے لیے اس کو اونٹ دیئے ہیں آپ نے فرمایا تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ تو نے اس سے کرایہ لینا ہے۔ عرض کی جی ہاں اب تمہاری خواہش ہے کہ یہ خیریت سے واپس لوٹے اور تو اس سے اپنا کرایہ وصول کرے، کسی ظالم کی خیریت اور زندہ رہنے کی خواہش کرنا ہی تو گناہ ہے۔ صفوان امام علیہ السلام کا پکا عقیدتمند تھا۔ اس کی ہارون کے ساتھ پرانی دوستی تھی۔ اس نے دنیاوی مقاصد کو ٹھکرا کر امام کا حکم مانا اور آخرت کو ترجیح دی۔ ہارون کو بتایا جاتا ہے کہ صفوان نے اپنے اونٹ بیچ دیئے ہیں۔ صفوان کو دربار میں بلوا کر پوچھتا جاتا ہے یہ تو نے کیا کیا؟ صفوان کہتا ہے چونکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں میرے بچے یہ کام نہیں کر سکتے اس لیے اپنے اونٹوں کو بیچ دیا ہے۔ ہارون بڑا چالاک شخص تھا، کہنے لگا اس کی وجہ بتاؤ؟ کہ تو نے یہ کام کیوں انجام

دیا؟ یہ سب کچھ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وجہ سے کیا ہے۔ صفوان بولا نہیں ایسی بات کوئی نہیں۔ ہارون نے کہا مجھے بے وقوف مت بنا۔ اگر تمہارے اور میرے درمیان دوستی کا پرانا رشتہ نہ ہوتا تو ابھی اور اسی وقت تیرا سر قلم کر دیتا۔
ہمارے آئمہ اس حد تک خلفاء کے ساتھ تعاون کرنے سے بھی منع کرتے تھے لیکن جب کبھی اسلامی تعلیمات اور دینی مقاصد کی بات ہوتی تو آپ اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے کہ جاؤ اور ظلم کے ساتھ رہ کر مظلوموں کی مدد کرو۔ صفوان کا معاملہ خالصتاً ہارون کے ساتھ مدد کرنا تھا۔ ایک شخص سرکاری عہدے پر رہ کر غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرتا ہے تو کام شرعی لحاظ سے جائز ہے، بلکہ ایسے اشخاص اور افراد کی موجودگی پر معاشرہ کے لیے نعمت تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے آئمہ علیہ السلام کی سیرت، قرآن مجید ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے۔
حضرت امام رضا علیہ السلام کا ایک استدلال بعض لوگوں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی پالیسی پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ آیا پیغمبروں کی شان بلند ہے یا ان کے اوصیاء کی؟ کہا گیا پیغمبروں کی۔ فرمایا کیا مشرک بادشاہ برا ہے یا فاسق مسلمان بادشاہ؟ کہا مشرک بادشاہ۔ فرمایا کہ کوئی تعاون کر نیکی خواہش کرتا ہے وہ بہتر ہے یا زبردستی طور پر تعاون کرانا بہتر؟ کہا تقاضا کرنے والا۔ فرمایا حضرت یوسف پیغمبر تھے عزیز مصر کافر و مشرک تھا آپ نے خود ہی اس سے تقاضا کیا تھا کہ:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ [1]

"(یوسف نے عزیز مصر سے کہا) مجھے ملکی خزانے پر مقرر کیجئے۔ میں اس کا امانتدار خزانچی اور اس کے حساب کتاب سے واقف ہوں۔"

[1] سورہ یوسف، ۵۵

حضرت یوسف علیہ السلام اس عہدے سے حسن استفادہ کرنا چاہتے تھے۔عزیز مصر کافر تھا اور مامون فاسق مسلمان تھا۔ یوسف پیغمبر تھے اور میں وصی پیغمبر ہوں۔ انہوں نے تقاضا کیا اور مجھے مجبور کیا گیا۔

ادھر حضرت امام کاظم علیہ السلام ایک طرف صفوان جمال کو ہارون کو اونٹ کرائے پر دینے سے منع کرر ہے ہیں، دوسری طرف علی بن یقطین (کہ جو مومن تھا اور تقیہ کئے ہوئے تھا۔) حضرت اس کی ہر طرح سے تشویق کرتے ہوئے اس سے فرماتے ہیں کہ اس عہدے پر کام کرتے رہو۔لیکن خفیہ طور پر۔۔۔۔۔۔۔کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ تم شیعہ ہو، وضو کرو تو ان جیسا، نماز بھی انہی کے طریقہ پر انجام دو، اپنے شیعہ ہونے کو حد سے زیادہ راز میں رکھو۔ آپ کا اہم عہدے پر موجود رہنا ہی ضروری ہے، کیونکہ تمہاری وجہ سے ہمارے حقدار مومنوں کی مشکلات دور ہو رہی ہیں۔

عام طور پر ہماری حکومتوں میں بھی ایسا ہوتا رہتا ہے کہ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے نمائندگان ہر دور حکومت میں معین کرتے ہیں۔ مذہبی جماعتیں بھی اپنے مذہبی نظریات کی تبلیغ اور تحفظ کے لیے ہر جگہ اپنے مبلغ بھیجتی ہیں۔حق اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے تمام آئمہ اطہار کی حکمت عملی ایک جیسی تھی، وہ ہر کام دینداری، خدا خوفی اور پرہیز گاری کے جزبہ کے تحط انجام دیتے تھے۔ یہ تمام حضرت بنو امیہ، بنوعباس کی حکومتوں کے ساتھ مدد کرنے سے منع کرتے تو سخت منع کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی ظالم حکومت کو فائدہ دینا ہی دراصل ظلم کی مدد کرنا ہے۔

لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کے فائدہ کی بات ہوتی تو آپ اپنے ماننے والوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے جیسا کہ علی بن یقطین اور اسماعیل بن بزیع کی مخلصانہ خدمات کو سراہا گیا۔ ہماری شیعہ روایات میں حیرت انگیز طور پر ان کی تعریف و توصیف کی گئی۔ ان کو اولیاء اللہ (دوستان خدا) کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

جناب شیخ انصاری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب مکاسب میں ولایت جائر کے بارے میں ان روایات کو نقل کیا ہے۔

ولایت جائر

ظالم کی حکومت ہماری فقہ کی کتب" ولایت جائر بہت اہم مسئلہ ہے۔فقہ میں ہے کہ ظالم حکومت میں کسی سرکاری عہدہ کو قبول کرنا ذاتی طور پر حرام ہے۔لیکن ہمارے فقہا نے فرمایا ہے کہ اگر چہ ذاتی حد تک حرام ہے، لیکن بعض امور میں مستحب اور بعض میں واجب ہے مجتہدین نے لکھا ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تبلیغی فرائض کی ادائیگی حکومتی عہدہ قبول پر موقوف ہو تو عہدہ قبول کرنا واجب ہے۔عقلی تقاضا بھی یہی ہے کہ اقتدار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ارفع و اعلیٰ اہداف کو حاصل کیا جائے۔ اور اس سے آدمی اپنے دشمنوں کو بھی کمزور کرسکتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں اور مالی لحاظ سے مضبوط لوگ اپنے آدمی مختلف عہدوں اور سرکاری شعبوں میں رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سے استفادہ کیا جائے ہم دیکھتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کا منصب قبول کر کے حکومت کا ایک کام بھی نہ کیا بلکہ آپ نے اس سے علمی و دینی مقاصد پورے کیے۔ اگر آپ کو یہ عہد نہ ملتا تو آپ کی علمی لیاقت، مذہبی صلاحیت دب کر رہ جاتی۔جس طرح اس وقت کی حکومت حضرت علی علیہ السلام سے دینی مسائل حل کراتی تھی، اس طرح مامون کی حکومت امام رضا علیہ السلام سے مشورہ کر کے لوگوں کی شرعی ذمہ داریاں پوری کرتی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو کام کرنے کا موقعہ ملا آپ نے علم وعمل کی ترقی و پیشتر میں وہ کارنامے نمایاں انجام دئے کہ جو رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔

حضرت صادق آل محمد علیہم السلام نے بنوعباس اور بنوامیہ کی باہمی چپلقش کی وجہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔آپ نے بہت کم عرصہ میں چار ہزار طلبہ پیدا کر کے

ملت اسلامیہ پر بہت بڑا احسان کر دیا۔ اسی طرح مامون چونکہ ایک دانشور حکمران تھا اس نے مختلف مذاہب کے علماء کو اپنے دربار میں بلوا کر امام رضا علیہ السلام سے مباحثے کرائے۔ اس عرصے میں آپ نے علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت میں بھرپور طریقے سے حصہ میں اس عہدہ پر فائز نہ ہوتے تو کما حقہ خدمت نہ کر سکتے۔ امام علیہ السلام نے ولی عہدی کے منصب سے ذاتی فوائد حاصل نہ کئے۔ البتہ علمی و دینی خدمت کے حوالے سے آپ نے اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اور یوں طالبان علم کی جستجوئے علم پوری ہوتی رہی۔

سوال و جواب سوال: جب امیر شام نے یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کیا تو اس کی سب نے مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ یزید کا فسق و فجور نہ تھا بلکہ لوگ بنیادی طور پر اس کی ولی عہدی کے مخالفت تھے۔ تو پھر کیا مومون خلافت میں کسی کا ولی عہد بنا کیسے جائز ہو گیا؟

جواب: سب سے پہلے تو یہ کہنا ہرگز غلط ہے کہ یزید کی صرف ولی عہدی کی مخالفت ہوئی ہے بلکہ مخالفت تو اس بات کی ہوئی کہ دنیا اسلام میں پہلی بار بدعت وجود میں آئی۔ امام حسین علیہ السلام نے بدعت کے خلاف آواز بلند کی۔ اس وقت یزید اسلامی تعلیمات کو تقریباً کالعدم قرار دے چکا تھا۔ یزید کا رویہ اور انداز فکر کافروں، مشرکوں اور منافقوں سے بھی بدتر تھا۔ اس بدکردار شخص کے بدکرداروں سے انسان تبھی شرماتی تھی۔ امام رضا علیہ السلام نے خود ولی عہدی کے تصور کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا تھا یہ ولی عہدی کیا چیز ہے بلکہ یہ خلافت تو ہمارا حق ہے۔ آپ نے مامون سے بھی کہا تھا مامون ذرا یہ تو بتا کہ خلافت تیرا حق ہے یا کسی اور کا ہے؟ اگر یہ غیر کا مال ہے تو تو دینے کا حق نہیں رکھتا۔

سوال: آپ فرض کریں کہ اگر فضل بن سہل واقعی طور پر شیعہ تھا کہ اس نے

حضرت کو ولی عہد بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے مامون کی حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کیا۔ اب یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ حضرت نے ایک مدت تک مامون کے حکومتی امور کا جائز قرار دیتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کیا حالانکہ حضرت علی علیہ السلام کی سیرت گواہ ہے کہ آپ ظالم کے کسی کام پر راضی ہونے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔

جواب: لگتا ہے یہ جو سوال اٹھایا گیا ہے سوچ سمجھ کر نہیں اٹھایا گیا ہے آپ نے کہا ہے کہ فضل بن سہل شیعہ تھا، اور حضرت مامون کی حکومتی سطح پر مدد کرتے رہے اور یہ کام جائز نہیں ہے، کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام نے امیر شام کی حکومت کو تسلیم نہ کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ مامون کی نسبت امام رضا علیہ السلام اور ماومن کی نسبت حضرت علی علیہ السلام کے مابین بہت فرق ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام کا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کی نیابت میں کام کرے۔

بھلا علی علیہ السلام جیسا عظیم امام امیر شام جیسے شخص کو کس طرح اپنا خلیفہ مقرر کر سکتا ہے؟ امام رضا علیہ السلام نے تو ایک روز بھی مامون کے ساتھ کسی قسم کی مدد نہ کی۔ یہاں پر ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے میں نلکے کی ٹوٹی کھول دیتا ہوں اور پانی آپ کے صحن میں جمع ہو جاتا ہے اور آپ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اس نقصان کا ضامن میں ہوں نہ کہ نلکا،، نہ میں ٹوٹی کھولتا اور نہ آپ کا نقصان ہوتا؟ پھر کسی اور وقت میں گلی سے گزرتا ہوں دیکھتا ہوں کہ وہاں پر نلکا کھلا ہوا ہے اور آپ کی دیوار تک پہنچا ہوا ہے۔ یہاں پر میری اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ نلکا کو بند کر کے آپ کی خدمت کروں، اور آپ کو نقصان سے بچالوں۔ یہاں پر پانی کا بند کرنا مجھ پر واجب نہیں ہے۔ میں نے عرض کی ہے کہ ان دو باتوں میں آپس میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہے کہ جو چاہو کرتے رہو، اور ایک شخص دوسرے شخص کے کسی کام

میں حصہ نہیں لیتا ہے بلکہ اس کو برے کاموں سے بھی روکتا ہے۔ اس صورت میں دوسرا شخص اگر گناہ کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری گناہ کے مرتکب پر ہوگی۔ امیر شام چاہتا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام اس کی حکومت کو تسلیم کریں۔

لیکن مامون کی خواہش یہ تھی کہ امام رضا علیہ السلام اس کی حکومت کے مقابلے میں خاموش رہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ امام رضا علیہ السلام مامون کی حکومت میں چپ کیوں رہے، خاموشی اختیار کیوں کی؟ عرض ہے آپ کسی بڑی مصلحت کے تحت خاموش تھے اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے حوالے سے ماحول سازگار ہو رہا تھا۔ کسی عظیم مصلحت کی خاطر انتظار کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے لیکن امیر شام کا مسئلہ ایک تو اور نوعیت کا تھا دوسرا امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نہیں چاہتا کہ ظالم کی حکومت ایک دن بھی رہے۔ اما علی علیہ السلام امیر شام کی حکومت پر خاموش رہتے تو امیر شام روز بروز طاقتور ہوتا لیکن یہاں پر صبر کیا جا رہا ہے مامون روز بروز کمزور ہوا، امام رضا علیہ السلام مضبوط ہوئے چنانچہ ان دو مسئلوں کا ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: میرا آپ سے ایک سوال یہ ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو زہر نہیں دیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا لوگوں کو معلوم ہو رہا تھا، خلافت کے حقدار حضرت امام رضا علیہ السلام ہیں، اس لئے مامون نے مجبور ہو کر حضرت کو زہر دے دیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السالام نے ۵۲ سال کی عمر میں دنیا سے کوچ فرمایا۔ آپ کی زندگی بالکل پاک و پاکیزہ تھی آپ کی صحت کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ حدیث میں ہے کہ:

"ما منا الا مقتول و مسموم"

"کہ ہم آئمہ میں سے ہر فرد یا تو قتل ہوا ہے یا زہر سے شہید کیا گیا ہے۔"

یہ بات شیعہ مورخین کے نزدیک مسلم حقیقت کا درجہ رکھتی ہے اب اگر مروج الذہب کے مصنف مسعودی نے غلطی کی ہے تو اس میں حقائق کو تو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا اس مسئلہ کے بارے میں کچھ وضاحت فرمائیے؟

جواب: میں نے کبھی نہیں کہا اور نہ ہی میرا عقیدہ ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو زہر سے شہید نہیں کیا گیا، بلکہ آپ نے میرے سوال کو میرا نظریہ سمجھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام علیہ السلام کو اس لیے زہر سے شہید کیا گیا کہ آپ کی مقبولیت عوام میں بڑھتی جا رہی تھی اور مامون کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو اس نے یہ بہیمانہ حرکت کر دی۔ امام علیہ السلام کی شہادت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ بغداد میں انقلابی تحریک کا خطرہ تھا لوگوں کی نظریں امام علیہ السلام کی وجہ خراسان پر جمی ہوئی تھیں۔ اس لیے اس نے امام علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کر دیا۔ اس وقت مامون کی عمر ۲۸ سال اور امام علیہ السلام کی ۵۵ سال تھی۔ شروع شروع میں حضرت نے مامون سے فرمایا تھا کہ تم ابھی جوان ہو اور ہم عمر میں تم سے بڑے ہیں۔ اس لیے ہم تم سے اس دنیا سے پہلے کوچ کریں گے مامون نے بدلتے ہوئے ماحول کو دیکھ کر اپنی عافیت اس میں سمجھی کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کو فضل کے درمیان سے ہٹا دیا جائے۔

چنانچہ فضل جب حمام میں گیا تو چند مسلح افراد نے اندر گھس کر اس کا کام تمام کر کے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، بعد میں مشہور کیا گیا کہ فضل کو خاندانی رقابت اور ذاتی جھگڑوں کی وجہ سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کا خون بھی رائیگان چلا گیا، حالانکہ فضل کے قتل کی سازش مامون ہی کی تیار کردہ تھی۔ فضل کے قتل کے بعد یہ پوری طرح سے ملک اور سیاست پر حاوی ہوگیا۔ جاسوسوں کے ذریعے اس کو بغداد کی سیاسی صورت حال معلوم ہوتی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام اور علوی سادات کی موجودگی میں وہ بغداد میں نہیں جا سکتا تو اس نے امام رضا علیہ السلام کے قتل کا

منصوبہ بنایا اور زہر دے کر آپ کو شہید کر دیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں اور ہمارے اس مؤقف کی تائید میں تاریخ کی سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں کہ امام علیہ السلام طبعی موت نہیں مرے بلکہ زہر کے ذریعے شہادت واقع ہوئی، لیکن اہل سنت کے کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت طوس میں بیمار ہوئے اور وہیں پہ فوت ہوئے۔ جن مورخین نے امام علیہ السلام کی طبعی موت کے بارے میں لکھا ہے دراصل وہ خبر اسی کی پیداوار ہے تاکہ سفاک قاتل مامون کے بہیمانہ جرم پر پردہ ڈالا جا سکے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں چند باتیں

آج کی رات امام عسکری علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی رات ہے، عید کی رات ہے اور ہمارے گیارہویں امام حسن عسکری علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے کی رات ہے چنانچہ اسی مناسبت سے ہم حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ) کی خدمت اقدس میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ میں اس نشست میں امام عسکری علیہ السلام کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا دور انتہائی پریشانیوں اور مشکلات کا دور ہے۔ امام زمانہ علیہ السلام کی ولادت کا زمانہ جوں جوں نزدیک ہوتا جارہا تھا سلاطین جور کی طرف آئمہ پر سختیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ امام حسن عسکری علیہ السلام سامرا میں سکونت پذیر تھے۔ اسی وقت مرکز خلافت یہی شہر تھا۔ معتصم کے زمانہ حکومت میں مرکز خلافت بغداد سے سامرا منتقل ہو گیا۔ کچھ مدت یہی مرکز رہا۔ اس کے بعد دو مرتبہ بغداد بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معتصم کے فوجی لوگوں پر بے تحاشہ ظلم کرتے، بے گناہوں کو بلا وجہ سے ستاتے پریشان کرتے تھے۔ لوگوں نے مظالم سے تنگ آ کر شکایت کی۔ شروع شروع میں معتصم نے پروا نہ کی لیکن، پھر عوام نے اس مرکز کی منتقلی پر رضامند کر لیا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ فوج اور مردوں میں فاصلہ رہے۔ اس لیے مرکز سامرا آ گیا۔ امام حسن عسکری علیہ السلام اور امام ہادی علیہ السلام کو مجبوراً سامرا آنا پڑا۔ آپ "العسکر یا العسکری محلہ" میں رہائش پذیر ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں فوج رہتی ہو اور آپ کو نظر بند کیا گیا ہو۔ امام حسن عسکری علیہ السلام جب شہید ہوئے تو آپ کا سن مبارک ۲۸ سال تھا۔

آپ کے والد گرامی کی عمر مبارک شہادت کے وقت ۲۴ برس تھی۔امام حسن عسکری علیہ السلام کا دور امامت چھ سال ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ ان چھ سالوں کے دوران یا تو قید میں رہے اگر کچھ دنوں کیلئے آزادی ملی تو پھر بھی آپ کو پابندیوں میں رکھا گیا۔لوگوں کا آپ کو ملنا جلنا اور آپ سے ملاقات کرنا بھی ممنوع تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کی زندگی قیدیوں سے بھی زیادہ پریشان کن تھی۔کبھی کبھی امام حسن عسکری علیہ السلام کو دربار مین بلوا کر پریشان کیا جاتا تھا۔عجیب وغریب صورت حال۔۔۔۔۔ گھٹن ہی گھٹن، کوئی بھی نہیں ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی دلجوئی کرے۔ان کربناک لمحوں میں امام علیہ السلام نے کس طرح وقت پاس کیا ہوگا؟ یہ تو امام ہی جانتے ہیں۔ یوں تو ہمارے تمام آئمہ طاہرین علیہم السلام تمام لوگوں سے ممتاز تھے، لیکن ہر امام تمام خوبیوں کی موجودگی میں ایک الگ خوبی بھی رکھتا تھا۔جیسا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کا رعب وجلال اور شان وشوکت اتنی زیادہ تھی دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ آپ سکون و وقار کے ساتھ قدم رکھتے، انتہائی شائستگی وشفتگی کے ساتھ بات کرتے۔ متانت کے ساتھ تبسم فرماتے تھے۔جب آپ گفتگو کرتے تو علم وعرفان کی بارش برس پڑتی تھی۔آپ کا دشمن کے سامنے آیا موم ہوگیا۔اس وقت کا جابر سے جابر شخص بھی آپ کی طرف آنکھ کر کے دیکھنے اور بات کرنے کی جرات نہ کرسکتا تھا۔

اس سلسلے مین جناب محدث قمی نے اپنی کتاب "الانوار البہیہ" میں ایک واقعہ نقل کیا ہے یا اس کو روایت کیا ہے۔احمد بن عبداللہ حافان یہ وزیر المعتمد علی اللہ کا بیٹا تھا۔انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے واقعہ نقل کیا ہے بہت ہی عجیب وغریب واقعہ ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام قید با مشقت کی سزا بھگت رہے تھا۔اس وقت کے حکمرانوں اور لوگوں میں یہ بات عام تھی کہ اسی امام کی صلب میں بارہویں لعل ولایت

نے ظہور فرمانا ہے۔جیسا سلوک فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا اس سے بدتر اس عظیم الشان امام کے ساتھ روا رکھا گیا۔فرعون کو نجومیوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا وہی بچہ تمہارے اقتدار کے زوال کا باعث بنے گا۔فرعون کے فوجی لڑکوں کو مارتے گئے اور بچیوں کو رہنے دیا۔ بار آور خواتین پر جاسوس عورتیں مقرر کی گئیں۔ یہی صورت حال امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور امامت میں پیدا ہوگئی۔ جناب مولوی نے کیا خوب شعر کہا ہے۔

حملہ بردی سوی دربندان غیب
تا ببندی راہ بر مردان غیب

یہ بھی کتنا بے وقوف تھا کہ اگر جاسوس کی خبر صحیح بھی ہو کیا وہ حکم الہی کو روک سکتا ہے؟ جب امام حسن عسکری علیہ السلام شہید ہوئے تو چند جاسوس عورتوں کو آپ کے گھر تفتیش کے لیے بھیجا گیا۔ان کو بتانے والوں نے بتایا دیا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کا "محمد" نام سے بیٹا پیدا ہو چکا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم ومہربانی سے ابھی تک یہ راز انتہائی پوشیدہ ہے یہاں تک کہ ولادت کے وقت کسی کو بھی خبر نہ تھی۔امام مہدی علیہ السلام چہ سال کے تھا کہ والد گرامی کا سایہ اٹھ گیا۔ چند خاص مومنوں کے علاوہ اس معصوم شہزادے کے بارے میں کسی کو خبر نہ تھی۔

کبی کبھار حکومت کی جاسوس عورتیں امام علیہ السلام کے گھر میں جاتیں کہ شاید ان کو امام مہدی (ع) نظر آجائیں اور ان کو اسی وقت قتل کر دیا جائے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا مقابلہ تو نہیں کیا جاسکتا۔اور نہ ہی کوئی مقابلہ کرنے کی جسارت کرسکتا ہے۔امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے دن پولیس نے امام علیہ السلام کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔کثیر تعداد میں جاسوس عورتیں خانہ امام میں داخل ہو گئیں شاید اسی گھر میں کوئی بار آور خاتون ہو؟ تلاشی لینے کے بعد عورتوں کو ایک کنیز نظر

آئی ان کو اس پر شک گزرا اس کو گرفتار کر کے زندان میں ڈالا گیا۔ ایک سال تک وہ بیچاری زندان کی سلاخوں کے پیچھے بند رہی لیکن جب سال گزر گیا تو ان کو پتہ چلا کہ یہ خاتون بے قصور ہے۔ بالآخر اس عورت کو رہا کر دیا گیا۔

امام حسن علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا نام نامی "حدیث" تھا ان کو جدہ بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ بی بی سرکار امام زمانہ علیہ السلام کی جدہ ہیں اس لیے ان کو جدہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں کچھ ایسی خواتین بھی ہیں کہ جن کو "جدہ" کہا جاتا ہے۔ اصفہان میں دو دینی مدارس "جدہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بی بی جدہ کے نام سے شہرت رکھتی تھیں۔ یہ معظّمہ بہت ہی عظمت و رفعت، رتبہ و منزلت کی مالکہ تھیں۔ جناب محدث قمی رضوان اللہ علیہ نے اپنی کتاب الانوار البہیہ میں لکھا ہے۔

یہ بی بی امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد مرکزی شخصیت کے طور پر زندگی گزار رہی تھیں۔ شیعہ خواتین آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مسائل حل کراتی تھیں۔ چونکہ امام حسن عسکری علیہ السلام ۲۸ برس کی عمر میں شہید ہوئے تھے، اس لحاظ سے اس بی بی کی عمر ۶۵ برس کے لگ بھگ لگتی ہے۔

بہت ہی جلیل القدر خاتون تھیں۔ آپ خواتین کے ذریعہ تمام مومنین، مومنات کے علمی و روحانی مسائل حل کرتی تھیں۔ ایک شخص بیان کرتا ہے کہ میں امام جواد علیہ السلام کی صاحبزادی جناب حلیمہ خاتون کے در اقدس پر گیا۔ یہ بی بی امام حسن عسکری علیہ السلام کی پھوپھی تھیں دروازہ پر کھڑے ہو کر میں نے مسئلہ امام کی بابت آپ سے سوال کیا، تو بی بی نے فرمایا گیارہویں امام حسن عسکری علیہ السلام ہیں۔ اور بارہویں امام۔۔۔۔ ۔تھوڑی خاموش ہو گئیں پھر فرمایا ان کا فرزند ارجمند۔۔۔۔۔ جو کہ اب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے وہ آخری امام ہے۔ میں نے عرض کیا بی بی اگر ہم اپنے امام وقت سے ملاقات نہ کر سکیں تو شرعی مسائل کے بارے میں کس سے سوال کریں؟ آپ نے فرمایا

جدہ کی طرف رجوع کریں۔ میں نے کہا کہ آقا اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور ایک خاتون کے بارے میں وصیت کر گئے ہیں۔ فرمایا امام حسن عسکری علیہ السلام نے وہی کام کیا ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام نے کیا تھا۔ حقیقت میں امام عالی مقام کے وصی امام سجاد علیہ السلام تھے لیکن امام زین العابدین علیہ السلام کی بیماری کی باعث آپ نے اکثر وصیتیں اپنی بہن جناب زینب سلام اللہ علیہا سے کی ہیں، یہی کام امام حسن عسکری علیہ السلام کو کرنا پڑا، کیونکہ آپ کے نائب تو امام مہدی علیہ السلام ہیں لیکن وہ پردہ غیبت میں ہیں اس لیے دینی و شرعی مسائل کی بابت جدہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

عدل و انصاف

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"اے ایماندارو! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ لیا ہے کہ وہ ان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور اپنا نائب مقرر کرے گا جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جس کو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انہیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے خائف ہونے کے بعد (ان کے خوف کو) امن سے ضرور بدل دے گا کہ وہ

(اطمینان سے) میری ہی عبادت کرتے رہیں گے اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنالیں اور جو شخص اس کے بعد بھی ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔" (نور، ۵۵)

تمام انبیاء اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں میں ہی مبعوث ہوئے ہیں ان کی تشریف آوری کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ومخلوق کے درمیان صحیح طریقے سے رابطہ قائم ہو، دوسرے لفظوں میں اپنے معبود حقیقی اور خالق حقیقی کے سوا کسی کی پرستش اور عبادت نہ کی جائے جیسا کہ کلمہ طیبہ میں کہا گیا ہے:

"لا الہ الا اللہ"

کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔"

انبیاء کرام کی بعثت کا دوسرا مقصد انسانیت کے مابین اچھا اور سازگار ماحول پیدا کرنا اور ان کو اچھے طریقے سے رہنے کی تعلیم دینا گویا تعلیم وتربیت انسانی زندگی کا اہم حصہ ہے، ان تمام نبیوں، رسولوں نے بنی نوع انسان کو عملی طور پر تلقین کی ہے کہ وہ عدل وانصاف، پیار ومحبت اور ایک دوسرے کی خدمت کے جذبے کے ساتھ زندگی بس کریں۔ قرآن مجید نے ان دو اہداف کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلے مقصد کی بابت خاتم الانبیاء کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے آپ کو (لوگوں کا) گواہ اور (نیکیوں کو بہشت کی) خوشخبری دینے والا اور (بروں کو) عذاب سے ڈرانے والا اور خدا کی

طرف سے اسی کے حکم سے بلانے والا (ایمان وہدایت کا) روشن چراغ بنا کر بھیجا۔" (سورہ احزاب)

مقصد بعثت کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

"ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح وروشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔" (سورہ حدید، ۲۵)

قرآن مجید نے کھلے لفظوں اور پوری وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد لوگوں میں عدل وانصاف کو نافذ کرنا ہے۔ آخری آیت میں ارشاد الٰہی ہے کہ ہم نے ان کو کتاب، دستور اور منشور کے ساتھ ساتھ میزان بھی دیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو عادلانہ نظام کے قیام کی تلقین کریں۔ گویا عدل وانصاف ہی انسانیت کی خوشحالی اور بقاء کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

عدالت روشنی بھی ہے اور زندگی بھی، اگر یہ نہ ہوتی تو انسانیت ایک دوسرے کی زیادتیوں کا شکار ہوکر صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔ تمام انبیاء کرام اس عظیم مقصد کو لے کر انسانوں ہی میں تشریف لائے، ان کا ایک مقصد تھا، ایک مشن تھا ایک ذمہ داری تھی وہ ہے عدالت ہی عدالت ۔ ۔ ۔ ۔ قرآن مجید نے تعلیم وتربیت اور عدالت کو انتہائی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہاں پر عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آیا عدالت کلی مراد ہے یا عدالت عمومی؟ یعنی کیا اور ایسا دور کبھی آئے گا کہ اس پوری کائنات میں ہر طرح کے ظلم

وستم ،جنگوں ،نفرتوں ،لڑائیوں اور چپقلشوں کا خاتمہ ہوا اور ہر طرح کی برائی کا خاتمہ ہو؟ کیا آنے والی صدیوں، یا مستقبل میں اس قسم کی گھڑی آئے گی کہ جس میں امن ہی امن ہو؟ ہمارے دوسرے مسلمان بھائیوں کا عقیدہ ہے کہ مکمل طور پر ہمہ جہت عدالت کبھی کبھی قائم نہیں ہوگی، کیونکہ این خیال است ومحال یہ دنیا بہت پست ہے اور اس کے باسی بہت ظلم ہیں۔ یہاں پر تاریکیوں، پریشانیوں، دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں عدل وانصاف مکمل طور پر نافذ ہو۔ ہر طرح کے جرائم اور مظالم ہوتے رہیں گے۔ عدالت تو صرف آخرت میں ہوگی جو کہ اللہ تعالیٰ خود نافذ فرمائے گا اور خود ہی فیصلہ کرے گا، کچھ غیر اسلامی طبقہ بھی اس طرح کی سوچ رکھتا ہے، لیکن شیعہ مذہب کہتا ہے کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ظلم وستم، جھگڑا وفساد عارضی چیزیں ہیں۔ انہوں نے ایک نہ ایک روز ختم ہونا ہی ہے۔ عدالت ضرور نافذ ہو کر رہے گی یہ روشنی، یہ امید صرف اور صرف مذہب شیعہ میں ہے۔ دیگر مذہب وادیان اس طرح عقیدہ نہیں رکھتے۔

ہمارے نزدیک انسانیت کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہے۔ عدالت کا قیام اور ارتقاء ایک نہ ایک دن ضرور عمل میں لایا جائے گا۔ قرآن مجید بھی ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے نوید دے رہا ہے کہ کائنات کا مستقبل روشن ہے اس سے متعلق متعدد آیات موجود ہیں۔ ان میں ایک آیت یہی ہے جس کو میں نے عنوان مجلس قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے انبیاء کرام کی بعثت کے دو اہم مقاصد بیان کیے ہیں۔ ایک توحید اور دوسرا عدالت کا نفاذ اور اجراء۔ سب سے پہلے تو انسان کا اپنے معبود حقیقی کے ساتھ رابطہ، دوسرا انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے، بنی نوع انسانوں کو عدل وانصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی گزارانی لوگوں یہ بات یاد کرانی چاہیے کہ ہمیں ایک نہ ایک روز اس خالق اکبر کے حضور پیش ہونا ہے، اس

لیے ہمیں اس کی رضا کیلئے کام کرنا چاہیے۔ یہ ایک حتمی امر ہے کہ اس جہاں میں انسان نے ایک عادلانہ نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں عدالت ہی عدالت ہوگی۔ تمام تر تاریکیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہر طرف روشنیوں کی حکمرانی ہوگی عدالت کی معطر ہوا تھکی ماندہ انسانیت کو سکون فراہم کرے گی۔ ہماری بحث کا مقصد یہ ہے کہ ایک روز ضرور ہی ایک مستقبل اور ہمہ جہت عدالت قائم ہوگی۔ اسلام بھی یہ کہتا ہے کہ ہم تین موضوعات پر بحث کریں گے۔ سب سے پہلے تو دیکھنا یہ ہے عدالت کیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ کیا عدالت انسان کی فطرت میں شامل ہے؟ یا فطرت میں شامل نہیں ہے؟ یا جس وقت انسان عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا کیا وہ زبردستی طور پر ہوگا یا اس کی اس میں رضا بھی شامل ہوگی؟ تیسری بات کہ عدالت عملی ہوگی یا نہیں، اگر ہوگی تو کس طریقے سے ہوگی؟۔

عدالت کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ عدالت کیا چیز ہے؟ شاید اس کی تعریف وتشریح بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص ظلم سے بخوبی واقف ہے اور عدالت ظلم کے مقابلے میں ایک حقیقت کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص اپنی ضروریات اور خواہش لے کر دنیا میں آیا ہے اور انہیں ضروریات کو پورا کرنے کیلئے وہ زندگی بھر مصروف کار رہتا ہے۔ عدالت کا معنی یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا حق ملے کہ ظلم کے برعکس ہے۔ ظلم یہ ہے کہ حقدار کو حق نہ دیا جائے یا کسی کو بے جا ستانا، یا پریشان کرنا بھی ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ قدیم زمانوں میں ایسے لوگ تھے جو عدالت کو سرے ہی سے مانتے تھے۔ قدیم یونان کے فلاسفہ اور یورپ کے مفکرین نے بھی اس موقف کی تائید کی ہے۔ ان کے نزدیک عدالت نامی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور عدالت کا تعلق طاقت سے ہے۔ قانون کا مقصد یہ ہے کہ انسان سے زبردستی طور پر فیصلے منوائے جائیں۔ میں ان مفکرین کا جواب نہیں دینا چاہتا

ورنہ اپنی گفتگوں کا مقصد بھی کھو بیٹھوں گا۔ دراصل عدالت حقیقی ہے اور یہ خلقت سے اخذ شدہ ہے چونکہ خلقت حقیقت ہے اور جو بھی موجود ہے وہ حقدار ہے۔ انسان کو اس کی محنتوں، کاوشوں کا صلہ ملنا چاہیے۔ عدالت کا معنی یہ ہے کہ حقدار کو حق ملنا چاہیے۔ متذکرہ بالا عبارت میں جو سوالات پیش کئے گئے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بے معنی سی گفتگو کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے؟

کیا عدالت فطری امر ہے؟ میری بحث کا دوسرا حصہ اس امر سے متعلق ہے کہ کیا انسان عدالت کی طرف فطری میلان رکھتا ہے کہ نہیں؟ ایک مثال دے کر آپ کو بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، آپ نے اس اجتماع میں شرکت کی ہے۔ آپ لکھے ہوئے بیزز کو دیکھیں کہ درمیان میں "لا الہ الا اللہ" لکھا ہوا ہے اور دائیں طرف "محمد رسول اللہ" اور بائیں طرف "علی ولی اللہ" درج ہے۔ کالے رنگ کا ستارہ نظر آ رہا ہے یہ بی بی فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی عصمت کو بیان کرتا ہے۔ دوسری طرف بارہ اماموں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ قرآنی آیات کو دیکھئے یہ سب آسمانی شعار ہیں۔ کہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لکھے ہوئے فرامین نظر آ رہے ہیں، تو کہیں پر مولائے کائنات علیہ السلام کے ارشادات درج ہیں، کہیں پر امام حسین علیہ السلام کے اقوال زرین لکھے ہیں اور کہیں پر امام حسین علیہ السلام کے ارشادات نظر آ رہے ہیں۔ ان خوبصورت فرامین کو انتہائی خوبصورت انداز کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ آپ ان خوبصورت تحریوں کو دیکھ کر، پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کو پسند کرنے پر کسی نے آپ کو مجبور تو نہیں کیا ہے؟ اچھی اور عمدہ تحریریں تھیں، آپ کو پسند آ گئیں۔ ہر انسان میں یہ قوت موجود ہے کہ جب بھی وہ اچھی اور خوبصورت چیز کو دیکھتا ہے تو اسے پسند کرتا ہے، یا اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے اب اس کے لیے کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی وہ اس کے لیے کسی کی پابندی قبول کرتا ہے۔ یہ ایک فطری امر

ہے اور فطرت پر کسی کو کسی قسم کا زور نہیں ہے۔ اس نوعیت کے تمام امور انسانی فطرت کے تابع ہیں۔ علم دوستی اور اس طرح کی دوسری چیزیں بھی بشری فطرت میں شامل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عدالت کو پسند کرنا، یا عادل ہونا، یا عادل شخص سے محبت کرنا، انسانی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں انسان کو کس قسم کا ذاتی فائدہ بھی نہ ہو پھر بھی وہ عدالت کو پسند کرے گا۔ یہاں تک کہ بعض عادل حکمرانوں کی کئی نسلوں تک قومی ہیرو کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس موضوع پر مزید بحث کرنے کیلئے ہم مزید آگے قدم بڑھاتے ہیں دیکھتے ہیں کہ اس کے بارے میں دوسرے دانشور حضرات کیا کہتے ہیں؟

نیچہ اور ماکیاول کے نظریات بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ انسانی فطرت میں اس قسم کی قوت سرے ہی سے موجود نہیں ہے۔ یورپ کے اکثر فلاسفر یہی سوچ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عدالت کا تصور کمزور طبقہ کا ایجاد کردہ نعرہ ہے۔ جب یہ لوگ طاقتور افراد کے مقابلے میں آتے ہیں بے بس ہو کر عدل و انصاف کا نعرہ بلند کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے بقول عدالت اچھی چیز ہے انسان کو عادل ہونا چاہیے۔ اس قسم کی باتیں زبانی جمع خرچی کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، کیونکہ آج کا کمزور شخص کل طاقتور بن جائے تو وہ پسماندہ طبقہ کے خلاف جارجیت کا ارتکاب کرنے لگ جاتا ہے۔ جرمن فلاسفر نیچہ کہتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے کہ لوگوں کو عدالت کی آواز بلند کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں اگر اس شخص کے پاس دولت اور طاقت آ جائے تو نہ جانے یہ کیا سے کیا کر گزرے۔ ان فلاسفر کے نزدیک انسانوں کو عدالت پر یقین ہی نہیں ہے۔ یہ جو باتیں سننے میں آتی ہیں یہ سب خالی خولی نعرے ہی تو ہیں۔

یہ تمام مفکرین اور دانشور انسانی فطرت میں عدالت کے وجود کے قائل ہی نہیں ہیں۔ پھر یہ حضرات دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان

کوعدالت کے پیچھے آروزو کی تمنا کرتے ہوئے نہیں بھاگنا چاہیے، بلکہ اسے قوت و طاقت بنانا چاہیے۔ عدالت تو برائے نام چیز ہے۔ اس کی آرزو بھی نہیں کرنی چاہیے، اور نہ ہی اس کے پیچھے دوڑنا چاہیے۔ اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ عدالت کی بجائے طاقت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عدالت نامی چیز کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔

برٹرنڈرسل کا نظریہ لیکن دوسرا گروہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتا ان کا کہنا ہے کہ عدالت کے نہیں پیچھے دوڑنا چاہیے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ انسان کا فائدہ صرف اور صرف عدالت میں مضمر ہے۔ مسٹر راسل کا بھی یہی نظریہ ہے وہ انسانی دوستی کے تصور کو دوسرے کاموں پر ترجیح دیتا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان چونکہ فطری طور پر منفعت پرست پیدا ہوا ہے، اس لیے سوچنے کی ضرورت ہے کہ آیا عدالت برقرار کی جائے؟ کیا انسان عدالت پسند ہے؟ ان تمام تر سوالات کا جواب دینے کے لیے ایک کام کرنا ضروری ہے کہ انسان علمی، عقلی اور فکری صلاحتیوں میں نکھار پیدا کریں۔ یہاں تک کہ انسانیت درست سمت کی طرف رواں دواں ہو جائے، چونکہ عدالت کے بغیر کوئی شخص کسی قسم کے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لیے عدالت کے تصور کو عملی جامہ پہنانا از بس ضروری ہے۔ اگر آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں تو آپ لازمی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ عدالت میں ہی سب کے فائدے موجود ہیں۔ مسٹر رسل عدالت کو ذاتی طور پر نہیں مانتے لیکن وہ کہتا ہے کہ عدالت سے انسان کو فکر و دانش کو تقویت حاصل ہوتی ہے اس لیے عدالت کا قیام ایک لازمی امر ہے۔

نہیں مسٹر راسل!! ہرگز نہیں! یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ تھیوری قطعی طور پر قابل نہیں ہے۔ مثال پیش کرتا ہوں کہ میں ایک کمزور آدمی ہوں اپنے ہمسایہ سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ

میں طاقتور ہو جاتا ہوں اب میں اس سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ وہ مجھ سے کمزور ہے اس وقت میں کس طرح عادل ہوسکتا ہوں؟ میرا علم مجھے کس طرح عادل بنا سکتا ہے؟ آپ نے کہا ہے کہ انسان مفاد پرست ہے۔ ادھر علم کہتا ہے کہ مفاد کے لیے بھی عدالت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہ اس وقت ہوگا کہ میں مدمقابل کے سامنے خود کو طاقتور خیال کرتا ہوں، لیکن جب خود کو مدمقابل کے سامنے طاقتور نہیں سمجھتا تو کس طرح عادل ہوسکتا ہوں؟ لہذا راسل کا فلسفہ انسان دوستی کے تمام تقاضوں کے خلاف ہے۔ وہ دنیا کے تمام تر طاقتور لوگوں کو جواز فراہم کرتا ہے کہ وہ جتنا بھی غریبوں، مظلوموں پر ظلم کرسکتے ہیں کریں۔

مارکسیزم کا نظریہ ان گروہوں میں تیسرا گروہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ عدالت عملی ہے لیکن انسان کے ذریعہ سے نہیں۔۔۔۔ انسان عدالت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہ کام انسان کا نہیں ہے اور نہ ہی انسان کی اس لحاظ سے تربیت کی جاسکتی ہے کہ وہ دل و جان سے عدالت کی آرزو رکھے اور نہ ہی علم و دانش انسان کو عدالت کی جستجو کا درس دیتی ہے۔ آپ عدالت کے پیچھے نہیں دوڑ سکتے۔ اگر آپ عدالت کو تلاش کرتے ہیں تو یہ سراسر جھوٹ ہے۔ آپ سرے ہی سے عدالت کے طالب نہیں ہیں۔ اگر تم سوچتے ہو تمہاری عقل ایک روز تمہیں عدالت کی طرف بلائے گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ لیکن حالات انسان کو خود بخود عدالت کی طرف لے جائیں گے۔ معاشی و اقتصادی ضروریات انسان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ سوشلزم کے نزدیک حالات کی وجہ سے عدالت وجود میں آتی ہے۔ آپ اگر چاہیں یا نہ چاہیں عدالت کو نافذ نہیں کرسکتے۔ انداز کیجئے۔ کہ آیا میری عقل مجھے عدالت کی طرف لے جائے گی آیا میری تربیت مجھے عدالت کی ضرورت کا احساس دلائے گی؟ وہ کہتے ہیں یہ سب باتیں جھوٹی ہیں۔

اسلام کا نظریہ اسلام کہتا ہے کہ عدالت انسان کی فطرت میں شامل ہے جو

لوگ عدالت سے گریزاں ہیں وہ ابھی تک منزل ارتقاء تک نہیں پہنچے۔ اگر انسان کی صحیح طریقے پر تربیت کی جائے اوراس کی تربیت کرنے والا اچھا انسان ہوتو وہ فطری طور پر عدالت کو ہی پسند کرے گا، جس طرح انسان خوبصورت اور عمدہ چیز کو پسند کرتا ہے۔ اسی طرح وہ عدالت کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہم مسلمان مفادات کی خاطر اپنے مذہب اور دین کو پسند نہیں کرتے، بلکہ اسے اس لیے پسند کرتے ہیں کہ یہ مذہب ہم مسلمانوں کو زندگی کے کسی موڑ پر تنہا اور بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ ہماری تاریخ میں ایسے افراد بھی پیدا ہوئے ہیں کہ جو خود بھی عادل تھے اور عدالت کو پسند کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے ذاتی منفعت کو ذرا بھر ترجیح نہ دی، وہ عدالت کو بہت زیادہ چاہتے تھے، اور عدالت کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کیا یہ لوگ اپنے اپنے دور میں بے مثال انسان تھے۔ انہوں نے حتی المقدور بنی نوع انسان کو سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت کی۔ اب اگر ہم ان جیسا کردار ادا نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عادلانہ نظام کے قیام کیلئے راہ ہموار تو کر سکتے ہیں۔

علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی کو دیکھ لیجئے آپ نہ فقط انسان کامل تھے بلکہ پوری نوع انسان کیلئے نمونہ عمل بھی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اور آپ کی محبت کا دم بھرنے والوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں کردار وگفتار کے حوالے سے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اب بھی دیندار طبقہ عدالت کو بیحد پسند کرتا ہے۔ ان کی اولین خواہش عدالت کا نفاذ واجراء ہی ہے۔ آنے والی نسلوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما رہے گا۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کا دور مبارک مشکلات اور سختیوں کا دور ہوگا۔ حالانکہ یہ بالکل ہی غلط ہے۔ آپ کا دور حکومت عملی، فکری، اخلاقی غرض کہ ہر لحاظ سے انتہائی ترقی اور خوشحال کا دور ہوگا۔ عدالت اپنے عروج کو پہنچے گی۔ یہ دین اسلام جو ہم تک پہنچا ہے اس نے حضرت حجت کے ظہور کو

عدل کلی سے تعبیر کیا ہے۔ اصول کافی کی حدیث میں ہے جب قائم آل محمد علیہ السلام ظہور کریں گے کہ تو رحمتوں اور برکتوں کی بارش برسے گی، لوگوں کے اذہان حد سے زیادہ ترقی کریں گی قوت فکر کے غیر معمولی اضافہ کے ساتھ ساتھ قوت عمل بھی حیرت انگیز طور پر بڑھے گی۔ آپ کے ظہور کے بعد بھیڑیئے اور گوسفند کی دیرینہ رقابت بالکل ختم ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ بھیڑیئے بھی ایک دوسرے سے صلح کر کے آرام وسکون سے زندگی بسر کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کونسے بھیڑیئے؟ جنگلوں میں رہنے والے خونخوار بھیڑیئے یا انسانی شکل وصورت میں چلنے پھرنے والے بھیڑیئے؟

دراصل ہر طرح کے خونخوار جانور اپنا وحشی پن چھوڑ دیں گے، ظلم وستم کا مکمل خاتمہ ہوگا۔ اب آتے ہیں آپ کی عمر مبارک کی طرف۔ کیا امام علیہ السلام اب تک زندہ ہیں اور آپ کی طولانی عمر کا کیا راز ہے؟ اور آپ کب تک زندہ رہیں گے؟

امام زمانہ علیہ السلام کی لمبی عمر کا راز کیا ہے؟

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو امام زمانہ علیہ السلام کی طولانی عمر کے بارے میں سن کر تعجب کا اظہار کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھلا ایک شخص ایک ہزار دو سو سال کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ اب تک جتنے بھی دنیا میں کام ہوئے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں دوسرے لفظوں میں آج کے جدید علوم مبنی بر حقیقت ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کے تمام تر تغیرات و معمولات غیر فطری ہیں۔ کیا روئے زمین پر حیات انسانی کا وجود علوم طبعیات کے ساتھ مطابق رکھتا ہے؟ انسان نے سب سے پہلے جو قدم رکھا ہے وہ کونسے طبعی و فطری قانون کے مطابق تھا؟ جدید علوم کی رو سے جاندار سے ہمیشہ جاندار چیز جنم لیتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ غیر جاندار سے جاندار چیز پیدا ہو۔ سائنس اس کا اب تک جواب نہ دے سکی۔ سب سے پہلی چیز جاندار نے روئے زمین پر کیسے اور کس طرح قدم رکھا؟ پھر دو انسانوں سے تخلیق کا عمل کیسے آگے بڑھا؟

اس کے بعد وہ کہتے ہیں تخلیق کا عمل شروع ہی سے دو حصوں میں بٹ گیا، ایک نباتات اور دوسرا حیوانات، نباتات کا سلسلہ خلقت اور ہے اور حیوانات کا اور بعض امور میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ گھاس ہو اور حیوان نہ ہو۔ اور حیوان ہو اور گھاس نہ ہو۔ درخت پودے یہ سب جاندار چیزیں ہیں، ان کا ماحول کو صحت مند اور پر فضا بنانے میں بہت بڑا کردار ہے۔ آج تک سائنس یہ نہ بتا سکی کہ یہ سلسلہ کب اور کس طرح شروع ہوا تھا۔ جس طرح سائنس انسانی تخلیق کے بارے میں حیران ہے، اس طرح وہ نباتات کے بارے میں بھی سرگرداں ہے۔ بعد کے کچھ

مراحل کے متعلق تو کچھ حد تک معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ لیکن تخلیق کے آغاز کی بابت سائنسدان آج تک کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے۔ انسان کے اندر ایک بہت بڑی کائنات پوشیدہ ہے۔ اس کی زندگی کا ہر راز ابھی تک پوری طرح سے کھل کر سامنے نہ آ سکا۔ انسان کی تخلیق اور قوت مشاہدہ، پختگی شعور اور قوت گویائی، دیگر محسوسات اپنی جگہ پر قدرت کا عظیم شاہکار ہیں۔

کیا وحی کوئی معمولی کام ہے؟ وہ وحی جو انسان کے پاس پہنچ کر غیر معمولی خبریں اور امور کی نشاندہی کرتی رہی کیا وہ انسان کے ایک ہزار تین سو سال تک زندہ رہنے سے کیا کم ہے؟ دراصل یہ ایک فطری امر اور قدرتی عمل ہے۔ یہ قانون فطرت تو ہے جو انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جدید سے جدید کام لے رہا ہے۔ آج انسان نئی سے نئی ایجادات سامنے لا رہا ہے۔ جدتوں، ندرتوں کی دنیا رنگ برنگی روشنیوں میں بکھر چکی ہے، اور جدید تحقیق کا سلسلہ مزید جاری و ساری ہے۔ بلکہ لمبی عمر پانے کے نئے نئے فارمولے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قانون فطرت یہ ہے کہ انسان ایک سو سال، پچاس سال یا دو سو سال یا پانچ سو سال زندہ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایسا بھی ہو کہ انسان کی لمبی عمر کا راز حاصل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی قدرت نمائی اور اپنے معجزات لوگوں کو دکھلاتا رہتا ہے۔ ایک ایسی صورت پیدا ہوتی ہے کہ ہم اس قنون فطرت کے ساتھ موازنہ نہیں کر سکتے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، اس لیے یہ ایسا موضوع نہیں ہے کہ اس میں مزید بحث و تمحیص کی جائے۔ یا نعوذ باللہ اس میں شک و شبہ کیا جائے۔ دین اور دنیا سب کے لیے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی چشم بصیرت کھولے، اور اپنے شعور کی دنیا آباد کرے، اور اپنی فکر کو محدود ماحول سے نکال کر وسیع و عریض فضاؤں میں لے جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ امام مہدی علیہ السلام کے دور مبارک میں انسان علم و حکمت، فکر و نظر، عقل و شعور غرضیکہ زندگی کے

تمام شعبوں میں ترقی کرے گا۔ اسکے بارے مین ہم مزید مطالب بیان کرنا چاہتے ہیں آپ کی صرف اور صرف توجہ درکار ہے۔

حضرت امام مہدی (عج) کے دور حکومت کی خصوصیات شیعہ سنی علماء و مورخین کا اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

لو لم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطول اللہ ذلك الیوم حتیٰ یخرج رجل من ولدی"

یعنی اگر فرض کریں کہ دنیا میں سے ایک دن سے زیادہ وقت نہ رہ گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اتنا طولانی کردے گا کہ میرے بیٹے قائم آل محمد علیہ السلام ظہور کریں گے۔"

اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک یقینی اور حتمی امر ہے کہ اگر دنیا ختم ہونے والی ہو تو بھی امام مہدی علیہ السلام نے تشریف لانا ہے۔ اس روایت کو اہلسنت اور اہل تشیع دونوں فرقوں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔

ہمارے بعض احباب جب دیکھتے ہیں کہ حجاز سے آئے ہوئے ہمارے مہمانان گرامی جناب شیخ خلیل الرحمن ہمیشہ امام زمانہ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں تو یہ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ شیعہ بھی نہیں ہیں لیکن امام علیہ السلام کے ظہور کی باتیں کر رہے ہیں۔ واقعتاً یہ حضرات امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور کے منتظر ہیں۔ دراصل یہ بات کسی ایک فرقے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ امام مہدی علیہ السلام ایک نہ ایک دن ضرور ظہور فرمائیں گے۔

اس سے آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام مہدی علیہ السلام کے دور حکومت کو انسانی ارتقاء کے آخری سٹیج سے تعبیر کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:

"المھدی یبعث فی امتی علی اختلاف من الناس والزلازل"

کہ حضرت مہدی علیہ السلام اس حالت میں تشریف لائیں گے کہ لوگوں کے درمیان شدید اختلافات اور زلزلے آئیں گے۔ ان زلزلوں سے مراد یہ ہے کہ لوگوں پر خطرات کے بادل منڈلائیں گے۔

"فیملاء الارض قسطا و عدلاً کما ملئت ظلماً و جورا"

کہ جب پیمانہ ظلم و جور بھر چکے گا تو آپ تشریف لا کر دنیا کو عدل و انصاف سے پر کر دیں گے۔

"یرضی عنه ساکن السماء و ساکن الارض"

کہ ان سے خدائے آسمان راضی ہے اور مخلوق خدا بھی اور لوگ شکر خداوندی بجالاتے ہوئے کہیں گے کہ اب ظلم و ستم ختم ہو گیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

"یقسم المال صحاحا"

کہ حضرت مہدی علیہ السلام لوگوں میں مال و دولت صحیح طریقے سے تقسیم کریں گے۔

پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا عدل و انصاف کے ساتھ برابر حصوں میں تقسیم کریں گے۔

"و یملا اللہ قلوب امة محمد غنی و یسعھم عدله"۔۔۔۔۔۔ [1]

اور اللہ تعالیٰ امت اسلام کے دلوں کو غنی کر دے گا۔ ان کے دل بھی دنیاوی آسائشوں اور آلائشوں سے بھر جائیں گے اور مالی وسائل کے لحاظ سے بھی وہ بے نیاز ہو جائیں گے غربت و افلاس کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گا۔ ہر طرح کی رقابتیں، دشمنیاں ختم ہوں گی۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"حتی تقوم الحرب بکم علی ساق بادیا نواجذھا مملوئة اخلافھا حلوا رضاعھا علقما عاقبتھا"

"یعنی (اس داعی حق سے پہلے) یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ جنگ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی، دانت نکالے ہوئے اور تھن بھرے ہوئے، جن کا دودھ شیرین و خوش گوار معلوم ہو گا لیکن اس کا انجام تلخ و ناگوار ہو گا۔"

الا وفی غدو سیاتی غد بما لا تعرفون"

ہاں کل اور یہ کل بہت نزدیک ہے کہ ایسی چیزوں کو لے کر آجائے جنہیں ابھی تک تم نہیں پہچانتے۔

"یاخذ الوالی من غیرھا عمالھا علی مساوی اعمالھا"

حاکم و والی جو اس جماعت میں سے نہیں ہو گا تمام حکمرانوں سے ان کی بدکرداروں کی وجہ سے مواخذہ کرے گا۔

[1] اعلام الوریٰ، ص ۴۰۱۔

"و تخرج له الارض افالیذ کبدھا"

اور زمین اس کے سامنے اپنے خزانے انڈیل دے گی۔

"و تلقی الیه سلماً مقالیدھا"

اور اپنی کنجیاں اس کے آگے ڈال دے گی۔

"فیریکم کیف عدل السیرة"

چنانچہ وہ تمہیں دکھائے گا کہ حق و عدالت کی روشنی کیا ہوتی ہے۔

"و یحیی میت الکتاب و السنة"

اور وہ دم توڑ چکنے والی کتاب و سنت پھر سے زندہ کر دے گا۔

ایک اور جگہ پر فرمایا کہ:

"اذا قام القائم حکم بالعدل"

جب قائم آل محمد علیہ السلام تشریف لائیں گے تو عدل و انصاف پر مبنی حکومت قائم کریں گے۔ ہمارے ہر امام کا ایک مخصوص لقب ہے جیسا کہ امیر المومنین کا علی مرتضیٰ علیہ السلام، امام حسن کا حسن مجتبیٰ علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام کا سید الشہداء اور دوسرے آئمہ السجاد، الباقر، الصادق، الکاظم، الرضا، التقی، النقی، الزکی، العسکری، لقب سے اس طرح امام زمانہ کا قائم ہے۔ یعنی قیام کرنے والا، انقلاب برپا کرنے والا۔ عدل و انصاف کو نافذ کرنے والا، گویا ہمہ گیر انقلاب اور عدالت آپ کی ذات اقدس کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

"و ارتفع فی ایامه الجور"

آپ کے دور حکومت میں ظلم و جود کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔

"و امنت به السبل"

تمام راستے امن وسلامتی کی علامت بن جائیں گے۔"

یعنی دریائی، زمینی اور ہوائی سفر محفوظ ترین ہوجائے گا۔ چونکہ عدل و انصاف کے نہ ہونے کی وجہ سے جرائم جنم لیتے ہیں لیکن جب عدل برقرار ہوگا، تو جرائم خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ پھر عدالت کا تصور انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اسلئے بدامنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"واخرجت الارض برکاتھا"

زمین اپنی تمام برکتوں اور اپنے تمام خزانوں کو باہر لے آئے گی۔

"ولا یجد الرجل منکم یومئذ موضعا لصدقته ولا بره"

(یہاں تک کہ) لوگوں میں صدقہ خیرات لینے والا (اور مانگنے والا) نہ ملے گا۔

"وھو قوله تعالیٰ والعاقبة للمتقین"

ارشاد خداوندی ہے کہ اچھا انجام اور کامیابی نیکوکاروں ہی کیلئے ہے:

اس وقت کے لوگوں کے لیے سب سے مشکل یہ ہوگی کہ ان کو صدقہ دینے کے لیے کوئی فقیر و نادار نہیں ملے گا، گویا غربت وافلاس کا نام تک نہ رہے گا۔ امام علیہ السلام توحید کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حتیٰ یوحدوا الله ولا یشرك به شیاء"

کہ سب کے سب توحید پرست بن جائیں گے شرک کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگا۔

"و تخرج العجوزة الضعیفة من المشرق ترید المغرب لا یؤذیھا احد"

ایک بوڑھی خاتون مشرق سے لے کر مغرب تک بھی اگر اکیلا سفر کرے گی تو اسے کوئی گزند تک نہ پہنچا سکے گا۔

امام علیہ السلام کے بے نظیر عادلانہ نظام کے بارے میں کتابوں بہت کچھ موجود ہے کہ آپ جب حکومت الٰہیہ کو تشکیل دیں گے تو لوگوں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوگا۔ برکتوں، رحمتوں کا نزول ہوگا، عوام مین دولت کی مساوی تقسیم ہوگی۔ بے پناہ وسائل موجود ہوں گے۔ ہر چیز کی فراوانی ہوگی۔ برائیوں کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگا۔ اس وقت انسان گناہوں سے نفرت کرے گا۔ جھوٹ، غیبت، تہمت، اور ظلم کے ناموں کو لوگ بھول جائیں گے۔ آخر یہ کیا ہے اور کیوں ہوگا؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ انسانیت کا انجام عدالت کا قیام ہی ہے۔ اس دور میں عدالت سب سے زیادہ پسندیدہ چیز سمجھی جائے گی۔ انسان کی روحانی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ اس کی تعلیم وتربیت پایہ تکمیل تک پہنچے گی۔ وہ حکومت عالمی امن کے قیام کا سب سے بڑااداعی ہوگا۔

ایمان اپنی پوری قوت سے جلوہ گر ہوگا۔ خدا پرستی اور خدا شناسی اپنے آخری نقطہ تک پہنچے گی۔ قرآن مجید کو سب سے بڑا مقام ملے گا۔ اس لیے ہم مسلمان خوش قسمت ہیں کہ دنیائے کفر انسانیت کے بارے جتنا مایوس کن رویہ اختیار کرتی ہے، ہم اس سے کہیں زیادہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے ایک عظیم اسلامی حکومت قائم ہوگی، ایسی حکومت کہ جس میں عدل وانصاف کے سوا دوسری چیز موجود نہ ہوگی۔

مسٹر راسل اپنی کتاب، "نئی امیدیں" میں لکھتا ہے کہ آج دانشوروں میں سے اکثر اپنی امیدیں ختم کر چکی ہے، کہ جدید دنیا کی جدید سوچ رکھنے والوں کا خیال

ہے کہ نئی ٹیکنالوجی اتنی زیادہ ترقی کر چکی ہے کہ انسان کا خاتمہ بھی اس کی وجہ سے ہوگا ایک یورپی دانشور کے بقول انسان نے اپنے ہاتھ سے اپنی قبر بنا رکھی ہے اگر ایٹمی بٹن پر انگلی رکھ دی جائے کہ پوری دنیا جل کر بھسم ہو جائے گی۔ واقعتاً اگر ہمیں خدا اور غیبی طاقت پر یقین نہ ہو اور قرآن کی بشارت پر ہمارا ایمان نہ ہو تو ہم بے اطمینانی و بے سکونی کا شکار ہو جائیں۔ آپ آج کی ترقی یافتہ دنیا کو دیکھ لیں تو خیال کریں کہ وہ حق پر ہیں، لیکن یہ ترقی عارضی اور فنا ہونے والی ہے۔ جب ہیروشیما میں ایٹمی اسلحہ سے انسانی تباہی کو دیکھ لیں تو ترقی کے نام سے نفرت ہونے لگے گی۔ آج آپ جدید ایٹمی ٹیکنالوجی کو دیکھ لیجئے کہ سائنسدانوں نے انسانی تباہی و بربادی کے لیے کیا سے کیا کر رکھا ہے، یہاں تک کہ دنیا اس جگہ پر آ کھڑی ہوئی ہے کہ جس میں فاتح مفتوح، غالب مغلوب کا تصور ہی نہیں ہے۔ اگر تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے تو اب یہ کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ آیا امریکہ جنگ جیت جائے گا یا روس یا چین فتح حاصل کر لیں گے۔ اگر تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے تو چیز مغلوب ہوگی وہ ہے انسانیت اور جو چیز غالب ہے اس کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن ہم مسلمان کہتے ہیں کہ ان تمام تر ایٹمی و سائنسی طاقتوں کے اوپر ایک طاقت ہے قرآن مجید کی سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۰۳ میں ارشاد ہے:

وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط

اور تم (گویا) ہوئی آگ کی بھٹی (دوزخ) کے لب پر (کھڑے تھے) اور گرنا چاہتے تھے، کہ خدا نے تم اس سے بچایا لیا۔

اور ہمیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"افضل الاعمال انتظار الفرج"

کہ تمام اعمال میں سے سب سے بہتر عمل، ایک مکمل کشائش اور فتح کا انتظار

کرنا ہے۔"

وہ اس لیے کہ یہ ایک اعلیٰ معیار کی ایمانی طاقت ہے، جو ہمیں امید دلاتی ہے اور کامیابی کی نوید بھی۔ بار الٰہا ہمیں امام زمانہ علیہ السلام کے حقیقی غلاموں اور ماننے والوں میں شمار فرما! خداوند ہمیں ایسا شعور عطا فرما کہ جس سے ہم ان کی حکومت برحق کا صحیح طریقے سے ادراک کر سکیں۔

"اللھم انا رغب الیك فی دولة کریمة تعزبھا الاسلام واھله وتذل بھا النفاق واھله وتجعلنا فیھا من الدعاة الی طاعتك والقادة الی سبیلك"

حضرت امام مہدی علیہ السلام

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔا ۭ

"(اے ایماندارو!) تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور (اپنا) نائب مقرر کرے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کیلئے پسند فرمایا (اسلام) اس پر انہیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے خائف ہونے کے بعد (ان کے ہراس کو) امن سے ضرور بدل دے گا کہ وہ (اطمینان سے) میری ہی عبادت کریں گے اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنا لیں گے۔" (سورہ نور، ۵۵)

امام زمانہ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی مناسبت سے ہماری گزشتہ بحث میں آنجناب علیہ السلام کے بارے میں تھی اور اس نشست میں بھی ہم امام علیہ السلام کے بارے میں چند مطالب بیان کریں گے۔ آج ہم تاریخی حقائق پر روشنی ڈالیں گے جو لوگ تاریخ اسلام اور مذہب حقہ کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے ان کا کہنا ہے کہ مہدویت کا تصور امام علیہ السلام کی ولادت کے زمانہ سے شروع ہوا ہے لیکن میں ان حضرات کی خدمت

میں حقائق پر مبنی کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ان کو بتایا یہ مقصود ہے کہ مہدویت کا تصور کہاں سے شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا ہے؟

قرآن وحدیث میں مہدویت کا تصور

سب سے پہلے قرآن مجید میں بنی نوع انسان کو واضح الفاظ میں خوشخبری دی گئی ہے۔ حضرت امام زمانہ علیہ السلام نے ہر صورت میں تشریف لا کر یہ عالمگیر اسلامی تشکیل دینی ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ آپ ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں لیکن ہم ان آیات میں ایک کو نقل کرتے ہیں، ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵

اور ہم نے تو نصیحت (توریت) کے بعد یقیناً زبور میں لکھ ہی دیا ہے کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔" [1]

قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ اس کائنات پر اس زمین پر ہمیشہ ظالم جاگیرداروں وڈیروں کا قبضہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح تمام مذاہب ختم ہو جائیں گے اور صرف اور صرف اسلام ہی واحد الٰہی مذہب رہ جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳

"وہی تو (خدا ہے) جس نے اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ (مبعوث کر کے) بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب

[1] سورہ انبیاء، ۱۰۵

کرے۔اگرچہ مشرکین برا مانا کریں" (توبہ، ۳۳)

اب آتے ہیں احادیث کی طرف سوال یہ ہے کہ آیا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کے بارے میں کیا فرمایا؟ کیا آپ نے کچھ فرمایا یا نہیں فرمایا؟ اگر امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں صرف شیعہ روایات ہیں تو پھر اعتراض کرنے والے اپنی جگہ پر درست کہتے ہیں اگر یہ مسئلہ واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضرور کچھ نہ کچھ فرمایا ہوگا۔ اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو پھر باقی تمام اسلامی فرقوں کی نقل کردہ روایات کو بھی تسلیم کرنا چاہیے، صرف شیعوں کی روایات کافی نہیں ہیں؟ ان سولات کا جواب واضح ہے۔ اتفاق سے امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں صرف شیعوں کی روایات نہیں ہیں بلکہ اہل تسنن کی روایات کے ظہور امام علیہ السلام کی بابت شیعوں سے زیادہ ہیں۔ اگر آپ ان کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو حقیقت حال ایسی ہی ہوگی۔

جس زمانے میں ہم قم المقدسہ کے زیر تعلیم تھے اس دور مین دو اہم کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں سے ایک کتاب آیت اللہ صدر مرحوم کی تھی۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی اور اس کا نام المہدی رکھا گیا، اس میں امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں جتنی بھی روایات نقل کی گئیں۔ وہ سب اہل سنت کی کتب میں سے تھیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسئلہ مہدویت کے بارے میں اہل سنت کی روایات شیعوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کمتر بھی نہیں ہیں۔ دوسری کتاب منتخب الآثر کے نام سے فارسی زبان میں تحریر کی۔ موصوف حوزہ علمیہ قم کے فاضل ترین نوجوان ہیں۔ آیت اللہ بروجردی نے حکم دیا کہ امام علیہ السلام کے بارے میں ایک جامع کتاب تحریر کی جائے۔ چنانچہ اس نوجوان فاضل نے یہ کتاب لکھ ڈالی۔ آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو زیادہ تر اہل سنت حضرات کی روایات نظر آئیں گی۔

میں نے روایات کے بارے میں بحث نہیں کرنی۔ میری بحث کا مقصد یہ ہے کہ آیا مسئلہ مہدویت تاریخ اسلام میں موثر ہے کہ نہیں؟ جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں اس اہم موضوع کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کے ارشادات موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہور کی خبر سنائی اور لوگوں کو بشارت دی کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا گویا میرا بیٹا اسلامی والٰہی حکومت کو تشکیل دے گا، وہ گھڑی کتنی خوش نصیب گھڑی ہوگی۔۔۔۔۔؟

فرمایا مولا علی علیہ السلام نے امیر المومنین حضرت علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں جو جملہ ارشاد فرمایا ہے آیت اللہ بروجردی کے بقول یہ جملہ احادیث کی دوسری کتب میں تسلسل وتواتر کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ کمیل بن زیاد نخعی کہتے ہیں کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور قبرستان کی طرف لے چلے۔

"فلما اصحر تنفس الصعداء"

جب آبادی سے باہر نکلے تو ایک لمبی آہ کھینچی" اور فرمایا:

"الناس ثلاثة فعالم ربانی و متعلم علی سبیل نجاة و همج رعاع"

دیکھو تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک عالم ربانی دوسرا متعلم کہ جو نجات کی راہ پر برقرار ہے اور تیسرا عوام الناس کا وہ گروہ کہ جو ہر پکارنے والے کے پیچھے ہوتا ہے۔ آپ نے یہاں اپنی تنہائی کا ذکر فرمایا ہے کہ کوئی بھی تو ایسا نہیں ہے جو مجھ سے اسرار و رموز حاصل کرے اور میں اسے دل کی باتیں بتاؤں پھر فرمانے لگے۔ ہاں یہ زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہے گی۔

"اللھم بلی لا تخلو الارض من قائم للہ بحجۃ اما ظاھراً مشھورا واما خائفا مغمورا لئلا تبطل حجج اللہ وبیناتہ۔۔۔ یحفظ اللہ بھم حججہ وبینائہ حتی یودعوھا نظراء ھم ویزرعوھا فی قلوب اشباھم " [1]

" ہاں اگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا کی حجت کو برقرار رکھتا ہے چاہے، وہ ظاہر و مشہور ہو خائف و پنہاں ہوتا کہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں۔ خداوند عالم ان کے ذریعہ سے اپنی حجتوں اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ ان کو اپنے ایسوں کے سپرد کردیں اور اپنے ایسوں کے دلوں انہیں بودیں۔"

قیام مختار اور نظریہ مہدویت

تاریخ اسلام میں سب سے پہلے نظریہ مہدویت مختار ثقفی کے زمانے میں شروع ہوا ہے جناب مختار امام حسین علیہ السلام کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب مختار بہت ہی اچھے، دنیدار، اور مجاہد شخص تھے۔ جناب مختار کو شروع ہی سے پتہ تھا کہ لوگ ان کی قیادت میں جہاد نہیں کریں گے کیونکہ امام وقت حضرت زین العابدین علیہ السلام موجود تھے۔ جناب مختار نے جناب امام سجاد علیہ السلام سے رابطہ کرکے انتقام لینے کی اجازت چاہی آپ خاموش رہے۔ شاید حالات اس امر کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چنانچہ مختار نے مسئلہ مہدویت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور محمد بن حنفیہ فرزند امیر المومنین کا نام استعمال کیا۔ ان کا نام بھی محمد تھا۔ روایات میں آیا ہے

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کا " اسمہ اسمی" وہ میرے ہمنام ہوگا۔ مختار نے کہا اے لوگو! میں مہدی دوران کا نائب ہوں جس کی پیغمبر اسلام نے بشارت دی تھی۔ جناب مختار ایک عرصہ تک خود کو حضرت مہدی علیہ السلام کے نائب کے طور پر متعارف کرواتے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد بن حنفیہ نے مہدی آخر الزمان کے طور پر اپنا تعارف کروایا تھا؟ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یزیدیوں سے انتقام لینے کیلئے انہوں نے اس قسم کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اس کی حقانیت پر ہمیں اب تک ثبوت نہیں مل سکا۔ (جناب شہید مطہری نے جناب مختار ثقفی کے بارے مین ایک روایت پیش کی ہے ورنہ مختار کی مجاہدت اور ان کی عظمت کی کوئی مثال ہی پیش نہیں کی جاسکتی کیونکہ شہدائے کربلا کے قاتلوں سے جس انداز میں اور جس طرح انتقام لیا وہ کوئی بھی نہ لے سکا اس لیے ان کو مختار آل محمد علیہ السلام بھی کہا جاتا ہے۔)

زہری کیا کہتے ہیں؟ ابو الفرج اصفہانی جو کہ اموی النسل مورخ ہیں اور شیعہ بھی نہیں ہیں، اپنی کتاب مقاتل الطالبین میں تحریر کرتے ہیں کہ جب زید بن امام سجاد علیہ السلام کی شہادت کی خبر زہری کو ملی تو انہوں نے کہا کہ اہل بیت علیہم السلام کے کچھ افراد جلدی کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ ایک وقت آئے گا کہ ان کا مہدی علیہ السلام ظہور کرے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کا مسئلہ اس قدر مسلم تھا کہ جب زہری کو جناب زید کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو ان کا ذہن فوراً جناب زید کے انقلاب کی طرف گیا اور انہوں نے کہا کہ اہلبیت علیہم السلام کے انقلابی اور پرخوش نوجوانوں کو صبر کرنا چاہیے۔ انقلاب تو صرف ایک ہی آئے گا اور ایک ہی لائے گا۔ وہ ہے انقلاب مہدی علیہ السلام، اور اس انقلاب کو لانے والے حضرت امام مہدی علیہ السلام ہی ہوں گے۔ میں زہری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ انہوں نے غلط کہا ہے یا درست، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ حضرت

امام مہدی علیہ السلام ایک نہ ایک دن ضرور تشریف لائیں گے اور وہ اپنے مشن و مقصد میں کامیاب و کامران ہوں گے۔

نفس زکیہ کا انقلاب لانا اور عقیدہ مہدویت

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام کے بیٹے کا نام بھی حسن تھا۔ ان کو حسن مثنیٰ کہا جاتا ہے، یعنی دوسرے حسن، جناب حسن، امام حسین علیہ السلام کے داماد تھے۔ فاطمہ بنت الحسین، حسن مثنیٰ کی شریکہ حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بیٹا عطا فرمایا اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ چونکہ یہ شہزادہ ماں باپ کے لحاظ سے نجیب الطرفین تھا اس لیے ان کو عبداللہ کے نام سے پکارا جانے لگا (کہ وہ نوجوان جو خالص الطرفین علوی اور خالص فاطمی ہے) عبداللہ محض کے دو صاحبزادے تھے ایک کا نام محمد اور دوسرے کا نام ابراہیم تھا۔۔۔۔۔۔ ان کا دور آخری اموی دور سے ملتا جلتا ہے۔ آپ اسے ۱۳۰ ہجری کہہ سکتے ہیں۔ محمد بن عبداللہ محض بہت ہی دیندار اور شریف انسان تھے۔ اس پیکر اخلاق و شرافت کو نفس زکیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آخری اموی دور میں حسن سادات نے انقلابی تحریک شروع کی کہ یہاں تک عباسیوں نے محمد بن عبداللہ محض کی بیعت کی۔ حضرت امام صادق علیہ السلام کو بھی میٹنگ میں مدعو کیا گیا۔ آپ سے درخواست کی گئی کہ ہم انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ عبداللہ بن محض کی بیعت کریں آپ بھی ایک جلیل القدر سید ہیں ان کی بیعت کریں امام علیہ السلام نے فرمایا آپ کا اس سے مقصد کیا ہے؟ اگر محمد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر انقلاب لانا چاہتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہیں اور ان کی حمایت بھی کریں گے۔

لیکن اگر وہ مہدی دوران بن کر انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ تو وہ سخت غلطی پر

ہیں، وہ مہدی نہیں ہو سکتے۔ میں ان کی اس حوالے سے تائید نہیں کروں گا۔ اگر کوئی حمایت کرے گا تو غلط فہمی کی بناء پر کرے گا کیونکہ ایک تو ان کا نام محمد تھا دوسرا ان کے کندھے پر تل کا نشان تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ مہدی دوران ہی ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسئلہ مہدویت مسلمانوں میں اس قدر اہم اور ضروری تھا کہ جو بھی صالح شخص انقلاب لانے کی بات کرتا تو اس کو مہدی آخر الزمان علیہ السلام تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ آقائے نامدار حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی مسلمانوں کی خوشخبری دی تھی اس لیے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات رچی بسی ہوئی تھی اور یہ تصور ان کی آمد تک رہے گا۔ یعنی اس بات پر سب مسلمان متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی آخری حجت حضرت قائم آل محمد علیہ السلام نے ضرور بالضرور تشریف لانا ہے اور دنیا کو عدل و انصاف سے آباد کر دیں گے۔

منصور دوانقی کی شاطرانہ چال

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ عباسی خلفاء میں ایک خلیفہ مہدی ہے یہ منصور کا بیٹا اور سلطنت عباسیہ کا تیسرا خلیفہ ہے۔ پہلا خلیفہ سفاح، دوسرا منصور، اور تیسرا منصور کا بیٹا مہدی عباسی ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ منصور نے اپنے بیٹے مہدی سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا پروگرام بنایا تا کہ وہ لوگوں کو دھوکہ دے سکے چنانچہ حسب پروگرام اس نے اعلان کر دیا کہ اے لوگو! جس مہدی کا تم لوگ انتظار کر رہے ہو وہ میرا بیٹا مہدی ہے۔ مقاتل الطالبین کے مصنف اور دیگر مورخین نے منصور کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنے بیٹے کو مہدی آخر الزمان کہہ کر جھوٹ بول کر کے عوام سے خیانت کی ہے۔ ایک روز منصور کے پاس اس کا ایک قریبی دوست مسلم بن قیتبہ آیا اور منصور نے اس سے پوچھا کہ محمد بن عبداللہ محض کیا کہتے ہیں؟ مسلم

نے کہا کہ وہ کہتا ہے میں مہدی دوراں ہوں۔ یہ سن کر منصور بولا وہ غلط کہتا ہے نہ وہ مہدی ہے اور نہ میرا بیٹا مہدی ہے۔ البتہ کبھی کبھار منصور لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ محمد بن عبد اللہ محض مہدی نہیں ہے بلکہ میرا بیٹا مہدی وقت ہے۔ مختصر یہ کہ پیغمبر اسلام کی روایات کی روشنی میں مہدویت کا تصور لوگوں میں عام تھا۔ اس لیے جب بھی کسی انقلابی نوجوان کو دیکھتے یا اس کا نام سنتے تو اس کو مہدی وقت تصور کرتے تھے۔

محمد بن عجلان اور منصور عباسی

مورخین نے ایک اور اہم واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ مدینہ کے ایک فقیہہ محمد بن عجلان نے محمد بن عبد اللہ کے پاس جا کر ان کی بیعت کی۔ بنوعباس شروع میں حسنی سادات کے حامی تھے۔ پھر مسئلہ خلافت پیش آیا اور یہ حاکم وقت ٹھہرے۔ انہوں نے برسراقتدار ہوتے ہی حسن سادات کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ منصور نے محمد بن عجلان کو اپنے دربار میں بلوایا کہ تم نے عبد اللہ کے صاجزادے محمد کی بیعت کیوں کی ہے؟ اس نے حکم دیا کہ ان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے کیونکہ انہوں نے ہمارے دشمن کی بیعت کی ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مدینہ کے تمام فقہا جمع ہو کر منصور کے پاس آئے اور ابن عجلان کی معافی کی درخواست کی اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا اس کا بیعت کرنے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ انہوں نے محمد بن عبد اللہ کو مہدی دوران سمجھ کر ان کی بیعت کی ہے۔ اس سے آپ کی دشمنی اور مخالفت کرنا مقصود نہ تھا۔

ان حقائق کی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ مہدویت کس قدر اہمیت کا حامل مسئلہ تھا؟ ہم جب بھی تاریخ کے مختلف ادوار کو دیکھتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارا امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور کا مسئلہ ہر دور میں مسلم رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ہر امام جب شہید ہوتا ہے تو دنیا والے خیال کرتے تھے کہ وہ امام

غائب ہوا ہے مرا نہیں ہے۔ گویا ہر امام کو مہدی دوران کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہی مسئلہ امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السلام، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور دیگر آئمہ کے ساتھ پیش آیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے ایک صاجزادے سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا انتقال ہو گیا جب حضرت غسل و کفن کا اہتمام کر چکے تو آپ نے اس کے سرہانے آ کر بلند آواز سے گریہ فرمایا اور بیٹے کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر اپنے اصحاب سے کہا کہ دیکھو میرا بیٹا اسماعیل ہے، یہ انتقال کر گیا ہے۔ کل یہ نہ کہنا کہ وہ مہدی تھا اور غائب ہو گیا ہے۔ اس کے جنازہ کو دیکھیے۔ اس چہرے کو خوب ملاحظہ کیجئے۔ اسے خوب پہچان کر اس کے انتقال کی گواہی دیں۔ یہ تمام باتیں اور شواہد اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ مسئلہ مہدویت مسلمانوں میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے جہاں تک میں نے تاریخ اسلام پر تحقیق کی ہے کہ ابن خلدون کے دور تک کسی ایک عالم دین نے بھی امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں احادیث سے اختلاف کیا ہو۔ اختلاف تھا یا تو وہ صرف فرعی اور جزئی تھا کہ آیا یہ شخص مہدی ہیں وہ شخص؟ کیا امام حسن علیہ السلام کا کوئی بیٹا ہے یا نہیں؟ کیا وہ امام حسن علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں یا امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں؟ لیکن اس امت کا ایک مہدی ضرور ہے؟ اور وہ اولاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولاد زہرا سلام اللہ علیہا میں سے ہے اور وہ اس دنیا کو اس طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسا کہ وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی۔ اس بات میں تو کسی کو کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے۔

دعبل کے اشعار

معروف شاعر دعبل خزاعی امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے

اشعار پڑھتا ہے ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

افاطم لو خلت الحسین مجدلا
وقد مات عطشانا بشط فرات

وہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے خطاب کرتے ہوئے ان کی اولاد پر ہونے والے مظالم کو ایک کر کے بیان کرتا ہے۔ دعبل کا مرثیہ تمام عربی مرثیوں میں سب سے بلیغ مرثیہ ہے۔ مورخین نے کہا ہے حضرت امام رضا علیہ السلام دعبل کا مرثیہ سن کر بہت زیادہ گریہ کرتے تھے۔ دعبل اپنے اشعار میں اولاد زہرا علیہا السلام کے مصائب کو ایک ایک کر کے بیان کرتا ہے۔ کہیں وہ فخ کے مقام پر سوئے ہوئے شہزادوں کا ذکر کرتا ہے، اور کہیں وہ کوفہ کے مزاروں کا دردناک لہجے میں تذکرہ کرتا ہے یعنی محمد بن عبداللہ کی شہادت کو بیان کرتا ہے۔ کہیں پر وہ امام سجاد علیہ السلام کے صاحبزادے جناب زید کی شہادت کو بیان کرتا ہے۔ کبھی سید الشہداء علیہ السلام کا ذکر اور کبھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کا تذکرہ اور کہیں پر نفس زکیہ کا ذکر کہ:

"وقبر ببغداد لنفس زکیة"

یہ سن کر امام علیہ السلام فرماتے ہیں یہاں پر اس شعر میں اس چیز کا اضافہ کرو:

"وقبر بطوس یالها من مصیبة"

میں نے عرض کی کہ آقا میں تو اس قبر کو نہیں جانتا فرمایا: قبر میری ہے۔ دعبل اپنے اشعار میں امام مہدی علیہ السلام تک ہونے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آخر ایک روز مصیبتوں، پریشانیوں اور مظالم کی حکمرانی کا دور آئے گا۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق کھول کر دیکھیں تو اس موضوع کی بابت ہمیں بے شمار شواہد ملیں گے کہ مسئلہ مہدویت صدر اسلام سے مسئلہ چلا آ رہا ہے۔ گویا یہ مسلمانوں

کی ضرورت ہے اور پسندیدہ موضوع بھی کہ آخری کوئی تو آئے گا جو ظلم کا خاتمہ کر کے عدل وانصاف کی حکومت قائم کرے گا۔۔۔۔ یقیناً وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہوں گے جن کا انتظار کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔ جب وہ تشریف لائیں گے تو کائنات کا ذرہ ذرہ جھوم اٹھے گا۔۔۔ مرحبا یا بن رسول اللہ۔

اہل تسنن ونظریہ مہدویت یہ مسئلہ صرف شیعوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ اہل سنت حضرات بھی ظہور امام مہدی علیہ السلام پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ اگر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ مہدویت کا دعویٰ کرنے والے جتنے شیعہ تھے اتنے ہی سنی تھے۔ جیسا کہ مہدی سوڈانی نے اپنے اردگرد کثیر تعداد میں افراد جمع کیے اور پھر اعلان مہدویت کر دیا، حالانکہ وہ سنی نشین علاقے اور ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ ہندو پاک میں مہدویت کے دعویدار گزرے ہیں۔ اسی طرح قادیانی مہدویت کے عنوان سے منظر عام پر آئے ہیں

روایات میں ہے کہ جب تک امام مہدی علیہ السلام کا ظہور پرنور ہو نہیں جاتا بے شمار جھوٹے دعویدار اور دجال سامنے آتے رہیں گے۔

حافظ کے اشعار

مجھے معلوم نہیں ہے کہ: حضرت شیعہ تھے یا سنی۔ خیال غالب یہ ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے لیکن جب ہم حافظ کے اشعار کو دیکھتے ہیں ان میں کہیں پر مسئلہ مہدویت کی خوشبو ضرور آتی ہے۔ وہ ایک جگہ پر کہتے ہیں:

"کجا است صوفی دجال چشم ملحد شکل"
بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ رسید"

کہاں ہے صوفی دجال جو کہ ملحد بھی ہے اور ایک آنکھ سے کانا بھی یعنی بدشکل

شخص اس سے کہہ دو کہ وہ جل جائے کہ مہدی علیہ السلام دین پناہ تشریف لا چکے ہیں۔

مژدہ ای دل کہ مسیحا نفسی می آید
کہ زانفاس خوش بوی کسی می آید

اے دل! تجھے مبارک کہ تیرے مسیحا تشریف لانے والے ہیں۔ کہ ہماری سانسوں میں کسی کی خوشبو مہک رہی ہے۔

از غم و درد مکن نالہ و فریاد کہ دوش
زدہ ام فالی و فریادرسی می آید

غم سے نڈھال نہ ہو زیادہ رو بھی نہیں کیونکہ میں نے فال نکالی ہے (مجھے یقین ہے) کہ میرا فریادرس آ رہا ہے۔

کسی ندانست کہ منزلگہ مقصود کجا است
اینقدر است کہ بانگ جرسی می آید

کسی کو خبر نہیں کہ اس کی منزل مراد کہاں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ گھنٹی کی آواز آنے والی ہی ہے۔

خبر بلبل ایں باغ میر سید کہ من
نالہ ای می شنوم کز قفسی می آید

وہ بلبل کی خبر اس باغ سے معلوم کر رہا ہے اور میں رونے کی آواز سن رہا ہوں کہ وہ بھی آزاد ہو جائے گا۔

میں نے تاریخی لحاظ س ء جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا اب دیکھنا یہ ہے کہ مہدویت کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے اشخاص کس طرح اور کب پیدا ہوں گے؟ یہ بھی ایک الگ بحث ہے۔ میں اپنی اس تقریر میں تین اہم مطلب بیان کرنا چاہتا ہوں۔

کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ چونکہ دنیا جب تک ظلم و جور سے پر نہیں ہو گی امام زمانہ علیہ السلام تشریف نہیں لائیں گے۔ جب ان کے سامنے اصلاح اور تبلیغ کی بات کی جائے یا کوئی نیکی کا جملہ کہہ دیا جائے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے ظلم کو بڑھنا چاہیے۔ تاریکی زیادہ ہو گی تو امام علیہ السلام ظہور فرمائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ نیکی پھیلاتے ہیں یا نیکی کی بات کرتے ہیں وہ امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور کی تاخیر کا سبب بن رہے ہیں۔ میں اس مطلب کو سادہ الفاظ میں بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت کھل کر واضح ہو جائے۔ میں ان سے کہتا ہے کہ نہیں صاحبو! حقیقت یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو یہ عقیدہ تو کھلی گمراہی ہے۔

انقلاب مہدی علیہ السلام

بعض حالات دنیا میں دھماکہ بن کر پیدا ہوتے ہیں۔آپ کوڑھ کی بیماری کو دیکھ لیجئے خدانخواستہ کسی انسان کے جسم پر جب نمودار ہوتی ہے تو پھیلتی جاتی ہے۔جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا کے تحت اس پر کوئی دوائی اثر نہیں کرتی۔اچانک پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔بعض ترقی پسند لوگ جو انقلاب کے حامی ہیں وہ حالات و واقعات کو دھماکوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ہر چیز جو اس قسم کے دھماکوں کو روکتی ہے، وہ چیز اچھی نہیں ہے اس لیے اصلاحی کاموں کے مخالف ہیں، ان کا کہنا ہے برائیاں ہونے دیں، ظلم وستم کو مزید بڑھتا چاہیے، پریشانیاں زیادہ ہوں۔جب برے کاموں میں حد سے زیادہ اضافہ ہوگا تو تب انقلاب کامیاب ہوگا۔لیکن اسلام اس کی سخت تردید کرتا ہے۔وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ہر دور میں تلقین کرتا ہے۔معاشرہ میں علم کی روشنی پھیلانے نیکی کی تبلیغ وترویج کرنے والوں کی اسلام میں وسیع پیمانے پر حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اگر ہم ترقی کا نعرہ بلند کرنے والوں کی بات مان لیں تو ہمارا سوال یہ ہے کیا ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسا اہم فریضہ ترک کردیں؟ اپنے بچوں کی تربیت کرنا چھوڑ دیں۔نماز نہ پڑھیں۔روزہ نہ رکھیں، زکوٰۃ نہ دیں، حج نہ کریں اور ہر قسم کی برائی کریں۔اس لیے کہ امام زمانہ کا جلد ظہور ہو؟ دراصل یہ سب کچھ فکری کجروی کے باعث کہا جارہا ہے۔یہ نعرہ کسی لحاظ سے درست نہیں ہے، بلکہ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔رہی بات انتظار امام علیہ السلام کی تو ایک حتمی اور ضرور امر ہے۔انتظار کرنا ہم سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔یہ ایک طرح کی رحمت الٰہی پر امید رکھنے کا نام ہے، تھکے اور ہارے ہوئے انسانوں کیلئے عدل وانصاف کی برقراری وبحالی کی خوشخبری ہے۔ان لوگوں کے انقلاب آفریں

دھماکے کی بات کی ہے یہ تصور بھی غلط ہے، کیونکہ فطرت کا ہر کام ارتقاء کی طرف جاتا ہے۔ آپ پھل کو دیکھ لیجئے۔یہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے پھر پک کر تیار ہوتا ہے جب تک وہ ارتقاء کی منازل طے نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔

امام زمانہ علیہ السلام کا ظہور مبارک بھی ایک ارتقاء کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اب تک نہیں ہوا کہ معاشرہ میں گناہ کم ہیں، بلکہ دنیا ابھی ارتقاء کی اس منزل تک نہیں پہنچی، لہذا آپ شیعہ روایات میں دیکھتے ہیں کہ جب تین سو تیرہ مخلص مومن پیدا ہوں گے تو امام علیہ السلام ظہور فرمائیں گے، یعنی اس حد تک دنیا زوال پذیر ہوگی کہ اچھے صالح افراد کا ملنا مشکل ہوجائے گا۔پریشانی بڑھے گی، لیکن پریشانی میں بھی فرق ہے۔دنیا میں عام طور پر جو بھی مشکل پیش آتی ہے اللہ تعالیٰ اس کا حل پیدا کردیتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا بہت زیادہ پریشان ہے، مسائل اور پریشانیاں بڑھتی جارہی جارہی ہیں۔اب ان مسائل کا حل دنیا کے طاقتور ملکوں اور بااختیار ترین حکمرانوں کے پاس بھی نہیں ہے۔وسائل کے ساتھ مسائل بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہوگا۔اگر ہوگا تو صرف قائم آل محمد علیہ السلام کے ظہور ہی میں ہوگا۔اب دیکھیں اس میں ایک سو سال لگتا ہے۔یا اس سے زیادہ مدت وقت کا کوئی تعین نہیں ہے۔

امام علیہ السلام کے عالمگیر انقلاب اور ظہور کا علم اس ذات اقدس کو ہے جس نے ان کو بھیجنا ہے، اور جس نے امام علیہ السلام کی طولانی عمر اور حفاظت کا اہتمام کر رکھا ہے، اور جس نے اس عظیم امام علیہ السلام کی برکت سے دنیا کو عدل وانصاف سے پر کرنا ہے۔اس ترقی یافتہ دور میں دنیا بھر دانشور، مفکرین کا خیال ہے، کہ انسانیت کی تمام تر محرومیوں کا خاتمہ اور حل اس وقت ممکن ہے کہ جب دنیا میں ایک ہی حکمران کی حکومت قائم ہوگی۔ایک بار پھر میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ جو نیکیوں کے فروغ کو ظہور امام علیہ السلام کی تاخیر کا سبب سمجھتے ہیں وہ انتہائی غلطی پر ہیں۔حقیقت میں نیکیاں ہی امام علیہ السلام کے ظہور کو قریب کریں گی۔

انتظار امام علیہ السلام کا مسئلہ

ہمارے ذہنوں میں یہ بات نہ ڈال دے کہ چونکہ ہم امام زمانہ کے ظہور کے منتظر ہیں اس لیے فلاں فرض ہم پر ساقط ہے ایسا نہیں ہے، ہر شرعی ذمہ داری ہم پر اسی طرح سے فرض رہے گی جیسا کہ وہ واجب ہوتی ہے۔اس موضوع کی بابت کچھ اور مطالب بھی ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث اپنی اس گفتگو کو مختصر کرتا ہوں آخر میں صرف اور صرف ایک بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔

مہدویت ایک عالمگیر نظریہ

آپ لوگوں پر فرض ہے کہ مسئلہ انتظار امام علیہ السلام کو ویسے ہی اہمیت دیں جیسا کہ دنیا چاہیے اور اس کے بارے میں ویسی ہی فکر کریں جیسا کہ اسلام ہمیں اس کی تعلیم دیتا ہے۔ہم نے اس مسئلہ کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ جس کا یہ حقدار تھا۔ہم اتنے بڑے مسئلہ کو چند جملوں اور چند لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔کہ امام علیہ السلام تشریف لائیں گے اور ظالموں سے انتقام لیں گے۔گویا حضرت امام زمانہ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر ہیں۔اور وہ تشریف لائیں۔ہمیں اپنا شرف دیدار عطا فرمائیں۔حالانکہ جیسا کہ اسلام ایک عالمی دین ہے اس طرح ظہور امام علیہ السلام بھی ایک عالمی مسئلہ ہے۔ہم شیعیان حیدر کرار علیہ السلام اس مسئلہ کو دنیا کا اہم ترین مسئلہ سمجھتے ہیں۔بلکہ ہماری زندگیوں کا دارمدار اسی انتظار پر ہے، ہماری سوچوں کا محور یہی انتظار ہے۔ہم پیدا بھی اسی انتظار کے لیے ہوتے ہیں اور زندہ بھی اسی انتظار کے لیے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کائنات کا وارث ضرور تشریف لائے گا۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا

عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿١٠٥﴾ [1]

"ہم نے تو نصیحت توریت کے بعد یقیناً زبور میں لکھ ہی دی ہے کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔"

بات ہو رہی ہے پوری کائنات کی ایک علاقہ کی بات نہیں ہے، اور نہ ہی ایک قوم کی ہے سب سے پہلے تو دنیا کا مستقبل خوش آیند ہے۔یورپی مفکرین کا کہنا ہے کہ انسانیت کا مستقل تاریک ہے انسان نے اپنی خود ساختہ ترقی سے اپنی موت خود خرید رکھی ہے۔ہمارے ہاتھوں سے بنایا ہوا اپنا ایٹمی اسلحہ ہماری تباہی کا سب سے بڑا سامان بنا ہوا ہے۔ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔انسان اپنی موت آپ ہی مرجائے گا۔لیکن ہمارا پاک و پاکیزہ مذہب، اسلام ہمیں درس دیتا ہے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انسانیت کا مستقبل انتہائی روشن اور تابناک ہے۔انسانی زندگی کا دوسرا عقل و عدالت ہے آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے تین دور ہیں۔پہلا دور بچپن، لڑکپن کا ہے جس میں وہ کھیلتا کودتا ہے، دوسرا دور جذبات کا دور ہے، تیسرا دور بڑھاپے کا ہے۔انسان ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہوتا ہے۔تجربات انسانی سوچ کو مضبوط اور پختہ بنا دیتے ہیں۔انسانی معاشرہ بھی تین ادوار اور تین مراحل کو طے کرتا ہے۔ایک دور افسانوی ہے قرآن نے اس کو زمانہ جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔دوسرا علم کا دور ہے۔لیکن علم اور جوانی نے ہمارے دور پر کیا کیا اثرات ڈالے ہیں؟

اگر ہم غور و خوض کریں تو دیکھیں گے کہ ہمارا دور خواہشات و جذبات کا دور ہے۔ہمارا دور بموں کا دور ہے، ایٹمی اسلحہ کا دور ہے۔ان ادوار کی کوئی حقیقت اور کوئی وقعت نہیں ہے۔ایسا دور کہ جس میں نہ معرفت موجود ہے نہ عدالت، نہ صلح محبت کا نام و نشان ہے، نہ انسانیت و روحانیت۔۔۔۔۔کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو

[1] سورہ انبیاء، ۱۰۵

اشرف المخلوقات بنا کر ادھورا چھوڑ دیا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس نے ایک روز ضرور ہی منزل ومقصود کی طرف پہنچنا ہے۔ چنانچہ مہدویت ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ اسلام کے پاس کس قدر خوبصورت اور جامع اصول موجود ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیر وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس میں کمال ہی کمال ہے، ارتقاء ہی ارتقا ہے۔ بقاء ہی بقاء، زندگی ہی زندگی، خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ کامیابی ہی کامیابی ہے۔۔۔ ماہ رمضان کا بابرکت اور مقدس مہینہ نزدیک ہے دعائے افتتاح کی تلاوت ضرور کرنا۔ یہ دعا حضرت امام مہدی علیہ السلام کی ذات والاصفات کے ساتھ خاص ہے میں بھی اس دعا کو پڑھوں گا اور آپ بھی ضرور پڑھنا۔

"اللھم انا نرغب الیك فی دولۃ کریمۃ تعز بھا الاسلام و اھلہ"

پروردگار! ہم تجھ سے ایسی عظیم حکومت میں زندگی گزارنے کی دعا کرتے ہیں کہ جس میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت ورتبہ حاصل ہو۔"

وتذل بھا النفاق و اھلہ"

اور اس میں منافقوں کو ذلت ورسوائی ملے گی۔"

"و تجعلنا فیھا من الدعاۃ الیٰ طاعتك و القادۃ الی سبیلك"

اور ایسی توفیق دے کہ ہم دوسروں کو تیری اطاعت وعبادت کی طرف دعوت دیں اور تیرے راستہ کی طرف لوگوں کی ہدایت کریں۔

بارالہا! ہمیں دنیا وآخرت کی کامیابیاں عطا فرمایا! اللہ ہم تجھے اپنے اولیاء اور نیک ہستیوں کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں کہ وہ کام کریں کہ جس میں صرف اور صرف تیری ذات کی رضا وخوشنودی پوشیدہ ہے۔

❀❀❀❀❀